وہ دِن
انوار علیگی

فائزہ جب نہا کر گنگناتی کمرے میں داخل ہوئی تو طارق اس کی تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو سامنے دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ اس کی یہ محویت فائزہ کی گنگناہٹ سے بھی نہ ٹوٹی۔

وہ ایک دلہن کی تصویر تھی جو اسے جھکائے' پلکوں میں خواب سجائے' ہونٹوں پر زندگی رچائے' ہلکا سا گھونگھٹ نکالے' اندیشے اور وسوسے چھپائے سنہری فریم میں جڑی ہوئی تھی۔

فائزہ بالوں کو جھٹکتے جھٹکتے ایک دم رک گئی۔ مسکرا کر پہلے اپنی تصویر کو دیکھا پھر طارق کو دیکھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ طارق کی

نظریں ضرور اس تصویر پر گڑی ہیں، لیکن دماغ کہیں اور ہے۔

یہ طارق کی پرانی عادت تھی۔ وہ اسی طرح چیزوں کو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتا۔ بات کرتے کرتے بھول جاتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیسٹ پر گانے سنتے سنتے سوچ کے پنجرے میں بند ہو جاتا۔

''طارق۔'' فائزہ نے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے' پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

''ہوں۔'' طارق نے مسکرا کر کہا۔

''دیوار والی دلہن کیا مجھ سے اچھی ہے؟'' فائزہ نے تولیہ کندھے پر پھیلایا۔

''آؤ میرے پاس۔'' طارق کی آنکھوں میں رنگ بھرنے لگے۔

''اچھا۔ زیادہ بدتمیزی پر نہ اترو۔'' یہ فائزہ کا ایک خاص جملہ تھا' وہ اس جملے کو ہمیشہ ایسے وقت بولتی جب طارق کو یہ بتانا مقصود ہوتا کہ

وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔

محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ بعض وقت لفظوں کا تیکھا پن اور لہجے کی بدتہذیبی پیار کا سر بن جاتی ہے۔

''آج کا پروگرام کیا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''سنو' آج دفتر سے چھٹی کیوں نہیں کر لیتے۔' فائزہ بولی۔

''نہیں' دفتر جانا ضروری ہے۔ ویسے میں ایک بجے تک آ جاؤں گا۔ کھانا باہر سے لیتا آؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''نہیں میں کھانا خود بناؤں گی۔'' فائزہ نے بالوں میں برش کرتے کرتے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

طارق نے فائزہ کی بات نہیں سنی' وہ ان کالی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب گیا اور سوچنے لگا کہ عورت کتنی گہری ہوتی ہے' اس کی وفا' اس کی بے وفائی' اس کی محبت' اس کی مکاری' اس کا چلتر پن جاننے

کے لیے مرد کو ہزاروں سال چاہئیں۔ عورت مرد کو آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے' کیونکہ صرف مرد کو عورت کی آنکھ کی پہچان نہیں ہوتی۔ جب کہ مرد کو دھوکا دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ عورت نہ صرف مرد کی نظریں پہچانتی ہے بلکہ اس کے جسم سے اٹھتی پرائی خوشبوئیں بھی محسوس کرلیتی ہے۔ خاص کر بیوی تو شوہر کے ایک ایک تیور سے واقف ہوتی ہے۔

طارق نے جانے کیا سوچ کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

''کیوں' میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں۔'' فائزہ نے اس کے گہرے اور ٹھنڈے سانس کی کچھ اور ہی مطلب نکالنا چاہا۔

''ہاں' جب شہد میں مرچیں شامل کردی جائیں تو پھر شہد کیسے اچھا لگے۔' طارق کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ یہ بات بہ آواز بلند کہہ دے' لیکن اس نے کہا نہیں۔ بڑے ضبط سے کام لیا' مصلحت کا تقاضا یہی

تھا۔

''نہیں' یہ بات نہیں..........تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے ہاتھوں کو کس قدر پسند کرتا ہوں' پھر ان ہاتھوں سے پکے کھانے کو کس طرح ناپسند کروں گا۔'' طارق نے اپنے لہجے میں مٹھاس بھر کر کہا۔

تب اسے احساس ہوا کہ اداکاری دراصل مکاری کا دوسرا نام ہے۔ اپنے وجود پر دوسرے وجود کو طاری کر کے جو کچھ کہا جائے وہ اداکاری ہو جاتی ہے۔

باتھ روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر فائزہ اپنے اصل روپ میں آ گئی۔ اس نے آئینے میں اپنی مکار آنکھوں کو دیکھا' شاطرانہ انداز میں مسکرائی اور زیرلب بولی۔ ''گدھا۔''

تب اسے احساس ہوا کہ اداکاری دراصل روپ بدلنے کا نام

ہے۔اپنے چہرے سے نقاب اتار کر اصل چہرے کے ساتھ سامنے آنے کا نام۔

طارق باتھ روم سے نہا کر نکلا' تب تک فائزہ ناشتا تیار کر چکی تھی۔ دونوں نے ناشتا خاموشی سے کیا' کوئی بات نہ ہوئی۔طارق نے ایک دو بار اس کے چہرے کو دیکھا' وہ کیتلی سے چائے پیالی میں ڈال رہی تھی۔اس کے کھلے بال چہرے پر پڑے ہوئے تھے۔گھنے سیاہ ریشمی بال' گوری رنگت' ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ' چہرے پر دل موہ لینے والی معصومیت۔طارق نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔کاش اس وقت یہ جتنی معصوم نظر آرہی ہے' ویسی ہی ہوتی تو اسے یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا۔ایک انتہائی قدم جو وہ اٹھانے جا رہا تھا' ہرگز نہ اٹھاتا۔

فائزہ حسب معمول اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔میٹھی آواز

میں ''خدا حافظ'' کہا۔ پھر اسے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔ زینے کے موڑ پر طارق نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور پھر سیڑھیوں میں گم ہو گیا۔

فائزہ نے ایک ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا اور اپنی زلفوں کو جھٹک کر دروازہ بند کر لیا۔

پھر اس نے جلدی جلدی گھر کے کام نبٹائے۔ ٹوکری اٹھائی۔ پرس ہاتھ میں پکڑا اور دروازے کو تالا لگا کر زینہ اترنے لگی۔

سودے سلف سے فارغ ہو کر اس نے کیمسٹ کی دکان کا رخ کیا۔

''فون کرنا تھا۔'' فائزہ نے اپنی مسکراہٹ کا جال پھینکا۔ ''کر لیں۔'' دکاندار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

فائزہ نے دھڑکتے دل سے نمبر ڈال کیے اور ریسور کو مضبوطی سے

پکڑلیا تا کہ انگلیوں کی لرزش پر قابو پایا جا سکے۔

''ہیلو۔'' ادھر سے جواب آیا۔ فائزہ نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ فون پر وہی ہے تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں بول رہی ہوں۔''

''ارے 'فائزہ تم...... بھئی تم نے بڑے اچھے وقت پر فون کیا' میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔''

''اسے کہتے ہیں سفید جھوٹ۔''

''ارے نہیں۔ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ اچھا یہ بتاؤ ٹیلی فون کہاں سے کر رہی ہو۔''

''جہاں سے کیا جا سکتا ہے۔'' فائزہ نے دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو دوائیں رکھنے میں مصروف تھا۔

”کسی دکان سے۔“

”ظاہر ہے۔“

فائزہ نے جواب دیا۔

”آج تمہاری شادی کی سالگرہ ہے؟“ ادھر سے پوچھا گیا۔

”ہاں۔“

”مبارک ہو۔“

”اچھا، فضول بات مجھے پسند نہیں۔“ فائزہ نے دھیرے سے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”کس بات کا۔“

”جس بات کی تم مبارک باد دے رہے ہو۔“

”بھئی تمہارے صاحب نے بتایا تھا۔ کل ہوئی تھی ان سے فون

''اچھا' یہ بات ہے!''

''صاحب تو آج گھر پر ہی ہوں گے۔'' ادھر سے سوال ہوا۔

''نہیں۔''

''کیا آج کے دن بھی وہ بے وقوف دفتر گیا ہے!''

''ہاں۔'' فائزہ نے اپنے لہجے میں مٹھاس بھرتے ہوئے کہا۔

''ارے! کیوں؟''

''ضروری کام تھا۔ ایک بجے تک واپس آ جائیں گے۔''

''اچھا' یہ بات ہے...... پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''تم جانتے ہو۔''

''میں آؤں؟'' ادھر سے پوچھا گیا۔

''صاف ظاہر ہے۔''

''ٹھیک ہے' پھر میرا انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر دوسری طرف سے

ریسیور رکھ دیا گیا۔

فائزہ نے مسکراتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ کال کے پیسے ادا کیے اور تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆..........☆..........☆

دروازے پر جب مخصوص دستک ہوئی تو فائزہ کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ آنے والا کون ہے؟ اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

آنے والا وہی تھا جس کا اسے انتظار تھا۔

''جلدی اندر آؤ۔'' فائزہ نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیوں' باہر کوئی طوفان آنے والا ہے؟''

''کوئی اگر دیکھ لےتو'' فائزہ نے دروازے بند کرتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا۔

''پڑوسیوں کو ان باتوں کی کہاں پروا ہے۔''

''یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہر شخص اپنی ذات میں مگن ہے۔ سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اتنا مصروف ہے کہ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔''

''اچھا ہی ہے ورنہ ہم جیسے لوگوں کا کیا بنتا ہے۔''

''ایک بات بتاؤ' دفتر میں کچھ بندوبست کر کے آئے ہو؟''

''کس چیز کا؟''

''طارق اگر تمہیں ٹیلی فون کرے تو؟'' فائزہ نے تشویش سے کہا۔

''میں اپنی سیکرٹری کو سمجھا آیا ہوں کہ اس نے کس کو کیا جواب دینا

ہے۔ تم مطمئن رہو۔ اسے ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں ہو گا کہ میں یہاں ہوں۔''

''اور اگر وہ کسی وجہ سے جلد گھر آ جائے تو؟'' فائزہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اس کی ذمے دار تم ہو گی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم فکر نہ کرو' میں سنبھال لوں گی۔''

''اچھا' اب وہ بات کرو جس بات کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔''

''جانے آج مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

تب ہی دروزے پر لگی گھنٹی کے بٹن پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

گھنٹی کی آواز سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ چہرے فق ہو گئے۔

''اب کیا ہوگا؟''

''تم ایسا کرو' باتھ روم میں چلے جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں' دروازے پر کون ہے؟''

''اگر طارق ہوا؟''

''اگر طارق ہوا تو میں اسے باتوں میں لگالوں گی۔ باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دوں گی۔ تم باتھ روم کا دروازہ کھول کر آرام سے نکل جانا۔''

ایک بار پھر گھنٹی بجی اور وہ فکرمند چہرہ لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ فائزہ نے اپنی گھبراہٹ پر کنٹرول کیا اور مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

دروازے پر ایک سیلز گرل کھڑی تھی۔ کسی اور وقت سیلز گرل آئی ہوتی تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے اس سے ملتی جو چیز فروخت کر رہی

ہوتی، ضرور لے لیتی، لیکن اس وقت، اس نازک وقت میں سیلز گرل کو دروازے پر دیکھ کر اندر ہی اندر اس کے آگ لگ گئی۔

''کہو بی بی۔'' فائزہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی پھر بھی لہجے کی درشتی کو وہ چھپا نہ سکی۔

''آپ مکھن کون سا استعمال کرتی ہیں؟'' سیلز گرل نے سوال کیا۔

''ہم کوئی مکھن استعمال نہیں کرتے۔ بغیر مکھن کے کام چلا لیتے ہیں۔'' اس نے چڑ کر جواب دیا۔

''پھر تو آپ بڑی ذہین خاتون ہیں۔'' سیلز گرل نے اس کی بات کا جانے کیا مطلب لیا۔

''آپ کے پاس جو مکھن ہے وہ مجھے دے دیں اور پیسے بتائیں۔'' فائزہ نے اسے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ دیا۔

سیلز گرل بھی اتنی آسانی سے سودا بکتے دیکھ کر خوشی ہوگئی۔

اس نے فوراً مکھن کے پیکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ کر پیسے بتا

''ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

پھر اس نے باتھ روم کا دروازے پر دستک دی' اس نے ڈر

ڈرتے دروازہ کھولا اور بولا۔ ''کون تھا؟''

''کوئی نہیں......تم بیڈ روم میں چلو' میں آ کر بتاتی ہوں۔''

فائزہ نے پرس سے پیسے نکالے' دروازہ بند کر لیا۔

پھر وہ مسکراتی ہوئی بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

''ایک سیلز گرل تھی' مکھن فروخت کرنے آئی تھی۔''

''پھر تم نے لے لیا؟''

''ہاں' جلدی سے جان چھڑا لی۔''

''لیکن ہمیں تو مکھن کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔

''اب تو لے لیا' پڑا رہے گا۔ وقت بے وقت کا آ جائے گا۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہارے لیے کیا بناؤں' چائے یا کافی؟''

''کچھ مت بناؤ........بس مجھے بے وقوف بناؤ۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بنے بنائے کو میں کیا بے وقوف بناؤں گی۔'' فائزہ نے ہنس کر کہا۔

تب اس نے فائزہ کے بال مٹھی میں بھر لیے اور انہیں کھینچتے ہوئے بولا۔ ''تو میں بے وقوف ہوں۔''

''بنا بنایا۔'' فائزہ نے شرارت سے کہا ''اچھا میرے بال تو چھوڑو۔''

''پہلے میری طرف دیکھو''

''لو' فائزہ نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولی........'' آج صبح

معلوم ہے کیا ہوا؟''

''ہوں۔''

''وہ اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجیب انداز تھا اس کے دیکھنے کا۔'' فائزہ اپنی تصویر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اسے تم سے بڑی محبت ہے شاید۔''

''ہاں' شاید۔'' پھر فائزہ نے فوراً رخ بدلا۔ ''تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟''

''نہیں' بالکل نہیں''

''دیکھو میں سنجیدہ ہوں۔''

''میں کب مذاق کر رہا ہوں۔''

''تو پھر بتاؤ نا۔''

''یہ کوئی بتانے والی بات ہے....... کیا تم نہیں جانتیں؟''

''میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ فریب دے رہی ہوں اور فریب کھا رہی ہوں۔ اب میں بہت ڈرنے لگی ہوں' کانپنے لگی ہوں۔ جانے میرا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے' مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔''

''تم جانتی ہو کہ میں پہلے ہی سے شادی شدہ ہوں۔''

''وہ تو میں بھی ہوں۔''

''میرے بچے ہیں۔''

''کیا مطلب تمہارا اس بات سے؟''

''دیکھو فائزہ تم یہ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئیں۔ لائف کو انجوائے کرو۔''

''میں تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں۔ مجھے اس کا صاف جواب چاہئے۔ اب میں زیادہ فریب نہیں کھا سکتی۔ تم اپنی بیوی کو

طلاق دو گے یا نہیں؟''

''فائزہ' فائزہ......یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اچھا بتاؤ آج تم اپنی شادی کی سالگرہ کس طرح منا رہی ہو؟'' اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''میں نے تم سے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔'' فائزہ نے بات نہ ٹالنے دی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میری بیوی میرے کاروبار کی مالک ہے' میں نے اسے طلاق دے دی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ دیکھو فائزہ' یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ویسے ہی سب کچھ حاصل ہے۔''

''یہ میری بے وقوفی تھی جو تمہیں سب کچھ حاصل ہوگیا۔ میں تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آگئی۔ میں نے اپنے معصوم شوہر کے

اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ اسے فریب دیا اور اب تک دیتی آ رہی ہوں' آج کے دن تک جب کہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ میں کتنی ذلیل ہوں' کمینی ہوں اور کچھ کم ذلیل تم بھی نہیں۔ تم نے اپنے دوست کی بیوی پر جال پھینکا۔ کتنے کمینے ہو تم' نکل جاؤ یہاں سے' میں کہتی ہوں فوراً نکل جاؤ یہاں سے' ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گی۔'' فائزہ ایک دم شیرنی کی طرح بپھر اٹھی۔

وہ ایک دم سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک فائزہ کو ہوا کیا۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''ٹھہرو' تم اس طرح نہیں جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے تیز چمکتی ہوئی بڑی سی چھری اٹھا لائی۔ ''چلو نکلو یہاں سے کمینے۔''

اس نے چھری کے اشارے سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے اس گھر سے نکل جائے اور آئندہ اس طرف کا کبھی رخ نہ کرے۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بہ مشکل اٹھا۔ اس کی سخت توہین ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ایک بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ فائزہ کو سمجھائے' اسے رام کرنے کی کوشش کرے' لیکن اس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر سمجھانے بجھانے سے باز رہا اور خود ہی سمجھ بوجھ کر گھر سے باہر آ گیا' پھر کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔

اس کے جانے کے بعد فائزہ گم صم سی کھڑی رہی۔ کبھی وہ اس لمبی

سی چھری کو دیکھتی جو اس کے ہاتھ میں تھی' کبھی اس خالی دروازے کو دیکھتی جہاں سے وہ ابھی گزرا تھا' کبھی اپنی تصویر کو دیکھتی۔ پھر اس نے چھری بیڈ پر پھینکی۔ باہر کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کیا اور بیڈ پر گر کر سسکنے لگی۔

سسکتے سسکتے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ ضبط کی دیوار گر گئی۔

جذبات بادلوں کی طرح اُمڈنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''یہ میں نے کیا کیا.........یہ میں نے کیا کیا۔''

پتا نہیں اس کے جانے کا پچھتاوا تھا یا یہ پچھتاوا کہ وہ اب تک ایسا کیوں کرتی رہی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے ایک غیر کو اپنا کیوں بنا لیا۔ ایک نا آشنا کو آشنا کیوں کر لیا۔

روتے روتے' چیختے چیختے وہ بے سدھ سی ہوگئی۔

تب اچانک طارق کا چہرہ اس کی نگاہوں میں ابھرا۔

''آہ' طارق! میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تمہاری عزت کو بے عزت کیا۔ تمہیں دھوکا دیا' میں تمہارے احسانوں کو بھی بھول گئی۔ اس وقت کو بھی بھول گئی جب تم نے میرے باپ کی عزت بچانے کے لیے مجھ جیسی لڑکی سے شادی کرنے کی حامی بھری تھی۔ تم بہت عظیم ہو اور میں بہت ذلیل ہوں۔ میں آج اس بات کا عہد کرتی ہوں کہ اب میں تمہیں سچی محبت دوں گی' ہمیشہ تمہاری ہو کر رہوں گی اور تمہاری رہ کر ہی مروں گی۔''

یہ عہد کر کے اس کے دل کو سکون سا ہوا' وہ روتے روتے سو گئی۔

فائزہ کے والد احمد میاں' طارق کے سگے ماموں تھے۔ طارق بچپن سے ہی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ یہ تین افراد پر مشتمل گھرانہ خوشحال تھا۔

تب ایک دن بیٹھے بٹھائے اس گھر کی تقدیر پھوٹی۔ گھر کی

خوشیوں کو آگ لگ گئی۔ زندگی عذاب ہوئی۔ جہنم بنی۔ ہوا کیا؟

ہوا یہ کہ طارق کے والد امان خاں نے حسب معمول فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن پاک کی اور مسکراتے ہوئے ناشتے کی میز پر آئے اور تازہ اخبار دیکھنے لگے۔ اتنے میں طارق بھی سکول کے لیے تیار ہو کر آ گیا۔ طارق کی امی ابھی باورچی خانے میں تھیں' ناشتے کی تیاری میں مصروف۔

''ابو جی.........السلام علیکم۔''

''آؤ بیٹا.........وعلیکم السلام۔'' امان خاں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اپنے بیٹے کو محبت سے دیکھا' پھر بولے ''سکول کے لیے تیار؟''

''جی ابو۔''

''اچھا طارق' ایک بات بتاؤ۔''

''جی ابو۔'' طارق نے مان خاں کی طرف توجہ سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

''لو بھئی، تمہاری امی بھی آ گئیں، گرم گرم ناشتا لے کر۔'' امان خاں نے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ سوال میں تمہاری امی کے سامنے کروں گا۔''

''کون سا سوال؟'' امی نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ابو کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے مجھ سے۔''

''اچھا، پھر پوچھیں........لو بیٹے یہ کھاؤ۔'' امی نے اس کے سامنے پلیٹ کھسکائی۔

''شکریہ امی۔'' طارق نے کہا۔

''بیٹے، بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟'' اس سے پہلے کہ طارق کوئی جواب دیتا، امان خاں دوبارہ بولے ''لیکن بیٹے'' ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی بات مجھ سے نہ کرنا۔ بچوں سے اس طرح کے جواب سن کر

مجھے ہرگز خوشی نہیں ہوتی۔"

"کیوں، ڈاکٹر بننا کوئی جرم تو نہیں۔" امی نے مداخلت کی۔

"نہیں........ڈاکٹر بننا کوئی جرم نہیں، لیکن یہ جواب مجھے بہت آسان لگنے لگا ہے، رٹا رٹایا سا........"

"اچھا، چلیے آپ خود بتائیے کہ بیٹے کا کیا بنا چاہتے ہیں؟"

"میں ابو، پائلٹ بنوں گا۔"

"ہاں، پائلٹ بننا برا نہیں، لیکن میں تمہیں قوم کے جہاز کا پائلٹ بننا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ابو؟"

"بیٹے، میں تمہیں صحافی بنانا چاہتا ہوں۔ جہاز کا پائلٹ تو ایک چھوٹا سا جہاز اڑاتا ہے جس میں چند سو مسافر ہوتے ہیں، لیکن صحافی جو ہوتا ہے وہ پوری قوم کا پائلٹ ہوتا ہے، بعض وقت تو لیڈر حضرات

بھی اس سے رہنمائی پاتے ہیں۔'

''ابو یہ صحافی کیا ہوتا ہے؟''

''صحافی وہ ہوتا ہے بیٹے جو سچ سچ اور جھوٹ جھوٹ لکھتا ہے۔''

اجی' کیا بات کرتے ہو۔ خود تو اکاؤنٹینٹ اور بیٹے کو بنانا چاہتے ہو صحافی۔ آخر یہ تمہیں سوجھی کیا۔'' بالآخر امی سے رہا نہ گیا '' بھئی ہمارا بیٹا صحافی وحافی کچھ نہیں بنے گا۔ اسے تو میں بزنس مین بناؤں گی۔''

''اپنے بھائی کی طرح!''

''ہاں' دیکھ لو' بھائی احمد میاں کے ٹھاٹ۔ اگرچہ بزنس زیادہ بڑا نہیں پھر بھی گھر میں خوب خوشحالی ہے۔''

''گھر تو تمہارا ابھی ویران نہیں بیگم۔''

''ہاں' ماشاء اللہ........ میرا گھر بھی خوب اچھا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے' میں کوئی ناشکری تو نہیں ہوں۔''

’’ہاں، بس اللہ سلامتی ہی رکھے۔ ورنہ اس شہر میں تو ہر سڑک پر قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔ کوئی دن ہی ایسا خوش نصیب ہوتا ہے جب اخبار میں کسی ٹریفک کے حادثے کی خبر نہیں چھپتی۔‘‘

اتنے میں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

’’جاؤ، بیٹا تمہاری سکول بس آ گی۔‘‘ امی نے کہا۔

طارق تیزی سے اٹھا، منہ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور حسب معمول دونوں کو ’خدا حافظ‘ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

’’طارق بیٹے‘‘ امان خاں نے آواز دی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔

طارق دروازے پر رک گیا۔ گاڑی کے ہارن کی پھر آواز آئی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ طارق کی امی نے شوہر کی طرف حیرت سے دیکھا۔

امان خاں، طارق کے نزدیک پہنچے، اسے گلے لگا کر پیار کیا اور بولے ''بیٹے گاڑی میں احتیاط سے بیٹھا کرو۔''

''جی ابو.........اچھا ابو خدا حافظ۔''

''کیا ہوا، خیر تو ہے آج تو بیٹے پر بڑا لاڈ آ رہا تھا؟'' طارق کے جانے کے بعد امی نے پوچھا۔

''بس جی چاہا کہ اسے پیار کروں تو کر لیا۔'' امان خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کوئی اعتراض؟''

''بھلا..........مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔''

''بیگم، یہ جو زندگی ہے نا........کتنی مختصر سی ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں ہم کیا کیا کرتے ہیں، کتنے گناہ کرتے ہیں۔ کتنے ظلم کرتے ہیں، کتنے دکھ پہنچاتے ہیں۔ اپنے سکھ کی خاطر دوسروں کو ہر وقت ملیا میٹ کرنے پر تلے رہتے ہیں اور انہیں جانتے کہ ہم جو کچھ کر رہے

ہیں اسے موت ایک لمحے میں برابر کے رکھ دے گی۔'' امان خاں بڑے جذب کے عالم میں بولے چلے جارہے تھے۔''اور بیگم' یہ جو موت ہے نا' جس سے ہم سب ڈرتے ہیں' دراصل وہی زندگی ہے۔ یہ دنیا تو محض ایک خوب ہے۔ فریب نظر ہے۔ اصل تو وہی ہے جہاں ہم نے جانا ہے' جس پر اس مکار زندگی نے پردہ ڈال رکھا ہے۔''

''ارے' یہ کیا آپ صبح ہی صبح موت کا ذکر لے بیٹھے! سچ بتاؤں امان' مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں جب اندھیری قبر کا تصور کرتی ہوں تو میرا رواں تھرا اٹھتا ہے۔''

''اچھا........لیکن مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ موت تو بہت اچھی چیز ہے۔''

''ارے' کچھ تو خوف کرو امان! تمہیں آج یہ کیا ہو گیا؟''

امان خاں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ محض مسکرا کر رہ گئے۔

جب وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو حسب معمول بیگم دروازے تک آئیں اور ان سے کچھ پھل وغیرہ ساتھ لانے کے لیے کہا۔

''میرا کوئی بھروسا نہیں بیگم۔'' امان خاں نے بیگم کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ہوسکتا ہے' میں بھول جاؤں' تم یہیں سے لے لینا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

امان خاں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر یونہی دروازے پر کھڑی رہیں۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ امان خاں نے انہیں ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا ہے۔ اب کے گئے وہ کبھی نہ پلٹیں

گے۔

گھر سے نکل کر انہوں نے رکشا پکڑا۔ حسب معمول رکشا ڈرائیور کو آہستہ چلنے کی تلقین کی اور اللہ کا نام لے کر رکشا میں بیٹھ گئے' رکشا والا شریف تھا' وہ مناسب رفتار سے رکشا چلا رہا تھا۔

تب ایک روٹ کی دو بسوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے ریس شروع ہو گئی۔ امان خان کے رکشا کے بائیں جانب ایک بس تھی اور دائیں جانب دوسری۔ بس کے دونوں ڈرائیور اس وقت ملک الموت کے روپ میں تھے۔ انہیں نہ اپنی فکر تھی' نہ اپنے بیوی بچوں کی۔ مسافروں کا بھلا وہ کیا خیال کرتے۔ بس خیال تھا تو صرف یہ کہ دوسری بس آگے نہ نکلنے پائے' چاہے جان نکل جائے۔

بس پھر کیا ہونا تھا۔ وہی ہوا جو دو پاٹن کے بیچ کسی چیز کا ہو سکتا ہے۔ دو پاٹن کے بیچ باقی بچا نہ کوئی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ چیخ پکار' ایک

کہرام مچ گیا۔ بسوں کے دونوں ڈرائیور ہلاک ہو گئے۔ رکشا ڈرائیور مرا اور امان خاں بھی موقع پر ہی اللہ کو پیارے ہوئے اور جانے کتنے زخمی ہوئے۔

پولیس، ایمبولنس، ہسپتال جانے والے جا چکے تھے، پیچھے بس یہ چکر رہ گئے تھے۔ امان خاں کی جیب میں دفتر کا شناختی کارڈ تھا۔ ان کے دفتر فون پر اطلاع دی گئی۔ اس خبر نے دفتر میں سناٹا طاری کر دیا۔ ایک اچھے انسان کی موت پر سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دفتر والے ہسپتال بھاگے۔

جب رات کے اندھیرے میں ایمبولینس سائرن بجاتی گھر کے دروازے پر رکی تو امان خاں کی بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا ہوا امان کو؟'' وہ چیختی ہوئی آگے بڑھیں۔

تب پڑوس کی عورتوں نے انہیں سنبھالا اور ایک عورت ان کے

ہاتھ میں پڑی سرخ چوڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑنے لگی۔

وہ ٹوٹتی چوڑیوں کو خاموشی سے دیکھنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں' وہ بے ہوش ہو گئیں۔

طارق کی اس وقت عجب حالت تھی۔ کبھی وہ اپنی بے ہوش ماں کو دیکھتا' کبھی چادر سے ڈھکی اپنے باپ کی لاش پر نظر ڈالتا۔ اس کے ننھے ذہن میں کوئی چیز واضح ہو کر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی تو وہ زندگی سے بھی واقف نہ تھا' پھر بھلا وہ موت کو کیا جانتا۔

امان خاں کی موت کے بعد احمد میاں نے اپنی بہن کو سہارا دیا' وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ طارق کی امی جوان تھیں۔ ان کی بہ آسانی دوسری شادی ہو سکتی تھی۔ ایک دو سال کے بعد احمد میاں نے ان سے اشارتاً بات کرنا چاہی' لیکن انہوں نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا۔ امان سے انہیں بہت محبت تھی' اس محبت کو وہ بانٹنا نہ چاہتی تھیں۔

انہوں نے کہا۔

''میں اب اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں بھائی صاحب۔''

وہ اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ واقعی ایسی ہی بات تھی۔ انہوں نے طارق کو اپنے گلے کا تعویز بنالیا تھا جو ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے ہوتا۔ ان کے ہاتھوں میں رہتا۔

پر اوپر والے کے فیصلے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ اس کی حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا' اس کی مصلحت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اوپر والے نے کچھ اور ہی فیصلہ کرلیا تھا۔

بس صرف چار برس لگے۔

چار برس میں اچھی خاصی تندرست عورت سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ احمد میاں نے اپنی بہن پر بہت توجہ دی' بہت علاج کرائے مگر سب

ڈاکٹروں نے ایک ہی جواب دیا' انہیں کوئی مرض نہیں ' اگر ممکن ہو تو
شادی کر دیجئے۔

جب احمد میاں انہیں ڈاکٹروں کا فیصلہ سناتے تو وہ پھیکی مسکراہٹ
کے ساتھ منہ پھیر لیتیں اور دھیرے سے کہتیں۔

بھائی صاحب! آپ بھی بڑے بھولے ہیں' خواہ مخواہ ڈاکٹروں
کے چکموں میں آجاتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

''دیکھو بہنا' اماں تو چلا گیا۔ اب تو طارق کی فکر کر۔ دیکھ' اس کو
اکیلا مت چھوڑ جانا۔''

''بھائی صاحب.........طارق کے لیے ہی تو یہ زندگی کی قید
کاٹ رہی ہوں۔'' انھوں نے اپنے بھائی کو گہری نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔''اور یہ آپ نے کیا کہا بھائی صاحب' میں اگر چلی بھی گئی تو
اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آپ جو طارق کے ساتھ ہیں۔ آپ کی

موجودگی میں کبھی وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرے گا۔"

شاید یہی سوچ کر طارق اپنے ماموں کی پناہ میں ہے' انہوں نے زندگی کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

ایک صبح انہوں نے طارق کو اپنے پاس بلا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اب طارق دس برس کا ہو چکا تھا۔ وہ کافی سمجھدار ہو گیا تھا۔ موت اور زندگی کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

"طارق' آج خواب میں تمہارے ابو دکھائی دیئے تھے۔"

"اچھا امی............ کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

ابھی وہ کچھ جواب بھی نہ دے پائی تھیں کہ احمد میاں کی آواز آئی

"طارق' بیٹے' بھئی کہاں ہو' چلو سکول۔"

جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو فائزہ بھی ان کے ساتھ تھی' وہ دونوں کو اپنی گاڑی میں سکول چھوڑا کرتے تھے اور لاتے بھی خود ہی

تھے۔

''اچھا' لاڈ ہو رہا ہے..........'' احمد میاں نے طارق کو اپنی ماں سے لپٹا دیکھ کر کہا۔

''بس ہو چکا........جاؤ بیٹا' خدا حافظ۔''

جب طارق سکول سے واپس لوٹا تو اسے اپنی امی نہیں ملیں۔ وہاں ایک لاش ضرور تھی جو چادر سے ڈھکی تھی۔ امی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بستہ ایک طرف پھینکا اور اپنی امی کی لاش سے لپٹ گیا۔

''نہیں امی........میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔''

طارق کے ماموں احمد میاں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولے۔ ''تو میرا بیٹا ہے طارق' تو میرا بیٹا ہے۔''

''ماموں جان' امی بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔''

”نہیں بیٹا تو اکیلا نہیں‘ میں ہوں تیرا‘ تیری ممانی ہیں‘ تیری ایک چھوٹی بہن فائزہ ہے۔ ہم سب تیرے ہیں۔ تو غم نہ کر۔“

خود احمد میاں کو اپنی بہن سے بے انتہا محبت تھی۔ یہ صدمہ ان کے لیے بھی سخت تھا‘ لیکن موت کے آگے کس کی چلی ہے۔ موت اندھیرے کا تیر ہے‘ جس کو لگ جائے‘ اسے پناہ نہیں ملتی‘ پناہ ملتی ہے تو بس اوپر‘ جہاں سے یہ تیر چلتے ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتے۔

وقت دکھوں کی بہترین مرہم ہے۔ یہ گزرتا ہے تو اپنے ساتھ دکھوں کو ہلکا کرتا جاتا ہے۔ احمد میاں کے دل کو بھی قرار آ گیا۔ طارق بھی صبر کی منزلوں سے گزر گیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ پڑھائی کی طرف مرکوز کر دی‘ جس کے نتیجے میں اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ یہ میٹرک کا امتحان ہی اس کے لیے آزمائش بن گیا۔ پڑھائی سے اچانک اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔

طارق، احمد میاں کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتے اسے اپنے دائرہ شفقت میں لیے رہتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گھر میں رہتے ہی کتنی دیر تھے۔ ایک بزنس مین کا گھر سے کم ہی واسطہ رہ جاتا ہے۔ وہ چاہے بھی تو اپنی مرضی سے گھر میں وقت نہیں گزر سکتا۔ مرد چاہے ملازم پیشہ ہو یا بزنس مین، گھر سے اس کا واجبی سا تعلق ہوتا ہے۔ واجبی سا ان معنی میں کہ گھر اس کے لیے محض شب بسری کا ذریعہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

گھر اصل میں ہوتا ہے بیگمات کا۔ احمد کا گھر بھی ان کی بیگم شائستہ کے ہاتھ میں تھا۔ شائستہ بھانجے میں اپنے شوہر کی بڑھتی ہوئی محبت کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ محبت کہاں جا کر ختم ہوگی۔ ویسے احمد میاں اس انتہا کا ایک آدھ بار اشارتاً ذکر بھی کر چکے تھے، لیکن شائستہ کسی قیمت پر فائزہ کو طارق کے حوالے نہیں

کرنا چاہتی تھیں۔ وہ فائزہ کے لیے کسی اور لڑکے کو منتخب کر چکی تھیں۔

احمد میاں اپنی بیوی کے اس انتخاب سے ناواقف تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی بیگم کو اس رشتے پر بھلا کیا اعتراض ہوگا' جبکہ وہ انہیں دن رات طارق پر نچھاور ہوتے دیکھتے تھے۔

بیگم شائستہ مگر اس ہاتھی کی طرح تھیں جس کے کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ طارق ایک حساس لڑکا تھا' ماں باپ کی موت نے اسے اور زود حس بنا دیا تھا۔ وہ گھر میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا۔ ممانی کی طنز آمیز باتیں اس کے دل پر چھری کی طرح لگتیں۔ وہ اسے باتوں ہی باتوں میں بہت سی باتیں کہہ جاتیں۔ فائزہ کا بھی کچھ اسی طرح کا حال تھا' شاید شائستہ نے اسے بھی سمجھا سیا تھا' وہ اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔

ماموں کے گھر سے نکلتے ہی طارق کی روح پر سناٹا طاری ہو

جاتا۔ قوت گویا کوئی مفلوج ہو جاتی۔ شائستہ ممانی کی گھورتی آنکھیں اسے ڈرانے لگتیں۔ فائزہ کے رویے کی سختی اس کے جسم میں کانٹا بن کر اترنے لگی۔ طارق کی حیثیت جیسے اچھوت جیسی ہو کر رہ جاتی۔

وہ اندر ہی اندر کڑھتا اور جلتا رہتا۔ اس آگ بھرے ماحول میں اس نے بچپن سے گزر کر جوانی میں قدم رکھا۔ اس نے بی اے کر لیا' لیکن گھٹتے ہوئے۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو سکا۔ احمد میاں کو اپنے بھانجے کی ذہنی کیفیت کا بالکل اندازہ نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ تو ہر وقت اپنی بیوی کو اس پر نچھاور ہوتے دیکھتے تھے اور یہی حال فائزہ کا تھا جس کا منہ ''طارق بھائی' طارق بھائی' کہتے نہ تھکتا اور ان کے اوجھل ہوتے ہی یہ ''بھائی'' دشمن میں تبدیل ہو جاتا۔

فائزہ نے کالج میں قدم رکھا تو اس کے چرچے عام ہوئے۔ لڑکیوں میں تو وہ اپنی شوخ طبیعت کی بنا پر مقبول تھا اور لڑکوں میں اپنی

بے جھجک گفتگو کی بنا پر۔ اس کی باتوں میں بڑی لگاوٹ ہوتی'

آنکھوں میں بلاوا اور لہجے میں کشش ہوتی۔ اسے لڑکوں کو غلط فہمی میں

مبتلا کرنے کا خبط تھا۔ وہ کالج کے ہر لڑکے کو اپنے دام میں الجھا ہوا

دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے شمع محفل بننے کا بڑا شوق تھا اور یہی شوق اسے

لے ڈوبا۔

یہ دل لگی' دل کی لگی بن گئی۔

فیضان آگے بڑھا اور اس نے اس چنچل تتلی کو اپنے دام فریب

میں الجھایا۔ بظاہر وہ فائزہ کے لیے شکار بن گیا' اصل میں وہ شکاری

تھا۔ فائزہ نے اسے بھی اپنی زلف کا اسیر کیا' اسے یہ اندازہ ہی نہیں

ہوا کہ وہ خود اسیر ہو رہی ہے۔

فیضان........ شطرنج کا ایک ایسا کھلاڑی تھا جس نے ہارنا سیکھا

ہی نہیں تھا۔

ایسی باتیں پر لگا کر اڑتی ہیں۔ آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ جلد ہی فائزہ کا نام فیضان کے ساتھ لیا جانے لگا اور کیوں نہ لیا جاتا' انہیں ساتھ ساتھ کہاں نہیں دیکھا گیا۔ ہوٹلوں میں' پارکوں میں' سمندر کے کنارے' گاڑی میں آئس کریم کھاتے تو کبھی سڑکوں پر پیدل گھومتے۔

احمد میاں کو کچھ پتا نہ تھا کہ ان کی بیٹی کالج میں کیا کھلا رہی ہے۔ وہ کالج جاتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں جاتی تو کالج کے نام پر کہاں جاتی ہے۔ سہیلیوں کا بہانہ بنا کر کہاں گھومتی ہے۔ اس بات سے تو اس کی امی بھی بے خبر تھیں۔ طارق کی شخصیت کو کچل کر وہ بڑے اطمینان سے اسے منسوب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

اخلاق کا اس گھر میں خاصا آنا جانا تھا۔ فائزہ اور اس کی بے تکلفی بھی تھی۔ یہ بے تکلفی طارق کو جلانے کے لیے بھی تھی۔ اخلاق کو اس

کی خالہ نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا' لیکن فائزہ کو اپنی امی کے منصوبے کا پتا نہ تھا۔ پتا ہوتا بھی تو کیا ہوتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو رہا تھا اور جو نہیں ہونا چاہئے وہ بھی ہو رہا تھا۔

بیگم شائستہ کا منصوبہ فائزہ نے بڑی ناشائستگی سے ناکام بنا دیا۔ نادانستگی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ذلت کے کنویں میں جا گری' جب یہ چھپی بات ظاہر ہوئی تو گھر میں زلزلہ سا آ گیا۔

شائستہ نے فائزہ کے بال پکڑ کر اسے اچھی طرح جھنجوڑا' اپنا ماتھا پیٹا' چیخی چلائیں' پر بے سود۔ اس بات کو اب احمد میاں سے چھپانا فضول تھا۔

باپ کے سامنے جب بیٹی کا کارنامہ آیا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا اتر گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فائزہ کو فیضان کے ساتھ فوراً

بیاہ دیا جائے۔ اس لیے کہ یہ دونوں کا مشترکہ کھیل تھا۔

احمد میاں نے فیضان سے ملاقات کی اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں بولے۔ ’’اب کیا ارادہ ہے بیٹے؟‘‘

’’فیضان ان کی بات سن کر چیونگم چباتے چباتے رک گیا اور سپاٹ انداز میں بولا۔ ’’آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’شادی۔‘‘ احمد میاں بمشکل بولے۔

’’پھر میرے والدین سے بات کر لیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔‘‘

احمد میاں اور شائستہ نے اسی دن فیضان کے والدین سے ملاقات کی اور انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ یہ ساری باتیں سن کر فیضان کے والدین بھڑک اٹھے۔

’’شادی...... شادی کو مذاق سمجھ لیا ہے آپ لوگوں نے۔ میں

پوچھتی ہوں، آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟''

''اپنے بیٹے سے پوچھیے۔ وہ آپ کو بتائے گا۔'' احمد میاں نے نرم لہجے میں کہا۔ میں اپنے بیٹے سے کیوں پوچھوں؟ آپ لوگوں سے کیوں نہ پوچھوں۔ پہلے اپنی بیٹیوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ نہیں پوچھتے کہ وہ کہاں جا رہی ہے، کہاں سے آ رہی ہے۔ اور جب وہ کسی سیدھے، شریف اور اچھے گھرانے کے لڑکے کو اپنے دام فریب میں الجھا لیتی ہے تو پھر مسکین صورت بنائے آ جاتے ہیں آپ لوگ، لڑکے کے والدین کے پاس۔ کان کھول کر سن لیجئے۔ میں اپنے بیٹے کے مستقبل سے آپ لوگوں کو نہ کھیلنے دوں گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ پڑھ رہا ہے اور یہ بھی سن لیجئے کہ یہ ایک شریف اور اعلیٰ روایات کا گھرانہ ہے۔ ہم اپنے بیٹے کو صرف اسی لڑکی سے منسوب کریں گے جو اس گھر کے شایان شان ہو گی۔ اب آپ لوگ جا سکتے

ہیں۔''

فیضان کی امی اور جانے کیا کیا بولتی رہیں۔ فیضان کے ڈیڈی خاموشی سے اس سارے ڈرامے کو دیکھتے رہے۔ احمد میاں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، شائستہ نے بھی منہ کھولا پر کسی کی کوئی بات نہ سنی گئی۔ چوری اور سینہ زوری والی مثل صادق آتی رہی۔

تب احمد میاں نے شائستہ کا ہاتھ پکڑا اور اس شاندار بنگلے کے پر تعیش ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ گیٹ پر کھڑی اپنی چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھے اور اپنے مکان کی طرف چل پڑے۔

دونوں راستے بھر خاموش رہے۔ شائستہ بار بار اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی رہی جبکہ احمد میاں اندر ہی اندر اپنے آنسو پیتے رہے۔ فیضان سے مل کر وہ خاصے پرامید تھے، لیکن اس کے ماں باپ نے تو بساط ہی الٹ دی تھی، اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟

آئیڈیل

محبت کی افسوں گری جہاں صاحبان محبت کو بے خودی کے طلسماتی جال میں گرفتار کر کے حال سے بیگانہ کرتی ہے وہیں یہی محبت وہ جرات اور ہمت بھی پیدا کر دیتی ہے کہ انسان اس کی خاطر پہاڑ سے دودھ کی نہر بھی نکال سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک محبت آشنا شخص کا فسانہ جو محبوب کی نگاہ التفات کی خاطر سخت جدوجہد کرتا رہا تھا۔

فائزہ کے سینے میں گولی اتار دیں یا اپنے سر کو نشانہ بنالیں تاکہ وہ بار بار دنیا والوں کے سامنے جھکنے کے بجائے ایک ہی مرتبہ جھک جائے اور ایسا جھکے کہ پھر اسے کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔

فائزہ نے جب اپنے والدین کو اوپر کی کھڑکی سے گاڑی سے غم زدہ اترتے دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ بات بنی نہیں۔ وہ تیزی سے نیچے اتر کر آئی اور سیدھی اپنی امی کے پاس پہنچی۔ اس کی امی بیڈ پر بیٹھی دروازے کو خالی خالی نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ احمد میاں دوسرے کمرے میں تھے۔ فائزہ اندر داخل ہوئی تو شائستہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''کیا ہوا امی؟'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''اب ہونے کو کیا رہ گیا ہے کمینی تو نے ہمارے منہ پر کالک مل دی۔ جیسا کتا وہ ہے ویسے ہی کتے اس کے ماں باپ ہیں۔''

''ہائے! امی انہیں کتا تو نہ کہیں۔'' فائزہ ابھی تک اس کے سحر میں گرفتار تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کیا عذاب جھیل کر آئے ہیں۔ اور اس کے پیارے گھر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے' انہیں کس طرح دھتکارا گیا ہے۔ اس طرح تو کوئی اپنے گھر سے کتوں کو بھی نہیں دھتکارتا ہوگا۔

یہ سن کر شائستہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے پاس پڑی ہوئی جوتی اٹھائی اور بے تحاشا اس کے سر پر برسانے لگیں۔

احمد میاں دوسرے کمرے میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ فائزہ نے بیٹھے بٹھائے انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا اور یہ عذاب سا عذاب تھا' بیٹی کا باپ ہونا بھی یارب کسی عذاب سے کم نہیں۔

شور وغل کی آواز سن کر وہ دوڑے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا

کہ شائستہ، فائزہ پر جوتے برسا رہی ہیں اور وہ زمین پر سر جھکائے بیٹھی پٹ رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔

"امی، مجھے خوب ماریں، اتنا ماریں کہ میں مر جاؤں۔ میں اسی قابل ہوں، میں نے واقعی آپ لوگوں کا دل دکھایا ہے۔"

احمد میاں کچھ دیر کھڑے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ پھر الٹے قدموں لوٹ گئے۔

فائزہ، ماں سے ساری روداد سننے کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئی۔ اسے فیضان پر بڑا اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ فیضان کے سامنے آنسو بھری آنکھیں لے کر جائے گی تو وہ ضرور اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ وہ اس کے لیے اپنے ماں باپ سے لڑ جائے گا، اس طرح اس کے والدین کی جو سبکی ہوئی وہ سرخروئی میں بدل جائے گی۔

وہ بڑی امید لیے کالج پہنچی۔ فیضان کو اس نے کالج میں ان تمام

ٹھکانوں پر تلاش کیا جہاں وہ مل سکتا تھا‘ پر وہ کہیں نہ ملا۔ وہ کالج آیا ہوتا تو ملتا بھی۔ وہ بزنس مین کا بیٹا تھا‘ ایسی چھوٹی موٹی ڈیلنگ تو خود بھی بہ آسانی کرسکتا تھا۔

جب فائزہ کو وہ کالج میں نہ ملا تو اس نے اس کے گھر فون کیا‘ فون اس کی ماں نے اٹھایا۔ پوچھنے پر جواب ملا کہ وہ لاہور گیا ہوا ہے۔

لاہور کا نام سن کر فائزہ نے اپنا دل تھام لیا۔

نہیں‘ ایسا نہیں ہوسکتا......... فیضان اتنا بداخلاق نہیں ہوسکتا۔ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ اس نے تو اس سے شادی کا عدہ کیا تھا......... ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ کیا ہوئے وہ وعدے‘ کیا ہوئیں وہ قسمیں‘ وہ اتنی آسانی سے دامن جھٹک کر نکل جائے گا‘ اسے امید نہ تھی۔

پھر فائزہ نے فیضان کے ایک دوست تنویر کو فون کیا۔ تنویر کو

فیضان اور فائزہ کے بارے میں سب کچھ پتا تھا' اتفاق سے ٹیلی فون تنویر ہی نے اٹھایا۔۔ ''تنویر بھائی.......میں فائزہ بول رہی ہوں۔ آپ کی طرف فیضان تو نہیں آئے؟''

''فائزہ آپ تھوڑا لیٹ ہو گئیں........فیضان ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔''

''اچھا.......مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ آج صبح لاہور چلے گئے۔''

''نہیں.......ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کسی نے مذاق کیا ہو گا۔''

تنویر نے خوش دلی سے کہا۔' آپ اگر بات کرنا چاہیں تو میں نمبر دوں۔ اس وقت وہ آپ کو شاہد حسن کے ہاں ملے گا' آپ شاہد حسن کو جانتی ہیں' نہیں آپ کہاں جانتی ہوں گی۔ خیر آپ نمبر نوٹ کر لیجئے۔''

فائزہ نے نمبر نوٹ کر کے فوراً اس نمبر پر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی بجنے کے بعد کسی لڑکی نے فیضان صاحب ہوں گے؟ براہ کرم ان سے

بات کروا دیجئے۔۔

''جی ہاں' ہیں۔'' ادھر سے آواز آئی۔ ''فیضان بھائی' آپ کا فون۔''

کچھ دیر کے بعد ریسیور پر جو آواز سنائی دی' وہ فیضان کی نہ تھی' کسی اجنبی کی تھی۔ ''کون بات کر رہا ہے؟''

''میں فائزہ بول رہی ہوں فیضان سے بات کرائیے۔''

''فیضان تو ابھی باہر نکلے ہیں۔کوئی پیغام ہو تو بتا دیجئے۔''

اب فائزہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ فیضان اس منہ چھپا رہا تھا۔منہ کیا' وہ تو اس سے آواز بھی چھپا رہا تھا۔تب فائزہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔اس نے غصے میں بھر کر کہا۔

''ہاں' اس کتے کے لیے ایک پیغام ہے۔اس سے کہنا کہ جیسا تو نے میرے ساتھ کیا ہے' خدا کرے تیری بہنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی

ہو۔ میرے ماں باپ جس صدمے سے دوچار ہیں' تیرے ماں باپ کو بھی ایسا ہی عذاب جھیلنا پڑے۔ تیری بہن بھی اسی طرح تڑپے جس طرح میں تڑپ رہی ہوں۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی دوست بینا نے ریسیور ہاتھ سے لے کر کریڈل پر ڈالا اور اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

تب فائزہ اس کی گود میں سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

''بینا بتا' اب میں کیا کروں؟'' کچھ دیر بعد فائزہ بولی۔

''میری خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' کیا بتاؤں تجھے۔'' بینا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔'' ان لڑکوں سے اللہ بچائے۔ تجھے میں اسی دن کے لیے ٹوکا کرتی تھی کہ ذرا اپنا دامن بچا' اس طرح ہر ایک سے بے تکلف ہونا ٹھیک نہیں۔''

''ہاں بینا' مجھ سے غلطی ہوگئی میں نے خواہ مخواہ فیضان پر اعتماد کر لیا۔''

فائزہ کچھ دیر اور بینا کے پاس بیٹھی۔ پھر تھکے قدموں سے اس کے گھر سے نکلی اور رکشا لے کر اپنے گھر پہنچ گئی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا جھکا سر بتا رہا تھا کہ فائزہ کو کیا جواب ملا ہے۔

شائستہ نے اسے مایوس کن نگاہوں سے دیکھا' جیسے کہہ رہی ہو' بیٹی میں جانتی ہوں' ان مردوں میں وفا کہاں ہوتی ہے۔ تو نے اپنا سب کچھ گنوا دینے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا۔

طارق کئی روز سے گھر میں ایک نامعلوم سی کھچڑی پکتے ہوئے دیکھ رہا تھا' ہر شخص کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ماموں جان کی بھی یہی حالت تھی۔ شام کو وہ

نڈھال نڈھال سے گھر آتے اور منہ لپیٹ کر پڑ جاتے۔ طارق ان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا' ان سے کچھ سننا چاہتا تھا کہ وہ انہی سے کچھ پوچھ اور سن سکتا تھا۔ شائستہ اور فائزہ تو اس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔

آخر ایک رات جب ماموں احمد میاں گھر کے صحن میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے اور شائستہ اور فائزہ کہیں گئی ہوئی تھیں' رات کے گیارہ بج رہے تھے' لیکن وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھیں۔ پتا نہیں وہ ان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے یا کوئی اور فکر انہیں بے چین کر کے ٹہلا رہی تھی۔

اس رات طارق بہت ہمت کر کے ماموں کے قریب آیا اور بولا ''ماموں جان' دو تین دن سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ پورا گھر پریشان ہے' لیکن پریشانی ظاہر نہیں ہو پا رہی ہے' اگر مجھے کسی قابل

سمجھیں تو بتائیں، شاید میں کسی کام آسکوں۔''

احمد میاں نے ٹہلتے ٹہلتے ایک نظر طارق کو دیکھا۔ پھر رک گئے۔ اسے اپنے قریب بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

''تمہارا ماموں بھنور میں پھنس گیا ہے۔''

''اللہ نہ کرے، آپ بات تو بتائیں۔''

''طارق، تمہیں فائزہ کیسی لگتی ہے؟''

''فائزہ آپ کی بیٹی ہے ماموں ں جان.......ظاہر ہے، مجھے اچھی لگے گی۔'' طارق نے بالکل سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

''بیٹے، کیا یہ ممکن ہے کہ تم فائزہ سے شادی کر لو۔'' احمد میاں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، یہ ممکن ہے۔''

اس جواب پر بے اختیار احمد میاں کا جی چاہا کہ وہ طارق کو اپنے سینے سے لگا لیں‘ لیکن وہ ایسا کرتے کرتے رک گئے۔ انہوں معلوم تھا کہ جب وہ ساری صورتحال اس کے سامنے رکھیں گے تو طارق فوراً کہے گا۔

’’ماموں جان.........یہ کیسے ممکن ہے! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں‘

احمد میاں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کمرے میں آ گئے اور بولے۔ ’’بیٹھو طارق...........میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم سب کیوں پریشان ہیں۔ میں بہرحال تمہیں مجبور نہیں کروں گا‘ لیکن تم نے سب کچھ جاننے کے باوجود فائزہ کو قبول کر لیا تو میں زندگی بھر تمہارا ممنون رہوں گا۔‘‘

’’ماموں جان.........آپ بتائیں تو آخر ہوا کیا؟‘‘

تب احمد میاں نے فائزہ پر جو بیتی‘ وہ صاف صاف لفظوں میں

طارق کو کہہ سنائی۔ وہ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھنا چاہتے تھے تاکہ طارق جو فیصلہ کرے، سوچ سمجھ کر کرے اور آئندہ یہ نہ کہے' ماموں جان آپ نے تو یہ بتایا ہی نہ تھا۔

فائزہ کا دکھ بیان کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گلا رندھا گیا۔ آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

طارق نے اٹھ کر انہیں ایک گلاس پانی پلایا۔ پھر وہ کرسی سے اتر کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔ ''ماموں جان' میں آپ کا ہوں۔ میں آپ کا دکھ بانٹ لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

یہ سن کر احمد میاں نے اسے فوراً اپنے قدموں سے اٹھایا اور برابر بٹھاتے ہوئے بولے۔

''بیٹے' میں تمہارا شکر گزار ہوں اور اس احسان کے بدلے میں

ہمیشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔‘‘

اور جب یہ بات شائستہ اور فائشہ نے سنی تو وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ سکتے میں آ گئیں۔ ارے نہیں‘ ایسا نہیں ہو سکتا‘ جس لڑکے کو ہم نے کبھی گھر کے ملازم سے زیادہ عزت نہ دی‘ ہمیشہ حقیر جانا‘ ہمیشہ ٹھوکروں میں رکھا‘ اسی نے ہمیں جب ہم خود ٹھوکروں میں تھے تو اٹھا کر سر پر بٹھالیا!

شائستہ اور فائزہ دونوں احسان مندی سے اس کے آگے جھک گئیں تو طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’یہ سب میں نے فائزہ کے لیے کیا ہے اور نہ آپ کے لیے۔ یہ میں نے اپنے ماموں کے لیے کیا ہے۔ میں انہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ یہ احسان تو ان کے آگے کچھ بھی نہیں۔‘‘

احمد میاں نے آناً فاناً شادی کی تیاری کی۔ فائزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس گھر میں جو کچھ تھا' اسی کا تھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ احمد میاں نے اپنی بیٹی کو بہترین جہیز دیا ساتھ ہی ایک فلیٹ بھی دیا، طارق کو انہوں نے اپنے بزنس میں شامل کرنا چاہا' لیکن اس نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ اپنی ملازمت کو ہی عزیز جانا' تب احمد میاں نے زیادہ ضد نہ کی۔

شادی کو ابھی مشکل سے دو تین ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک دن فائزہ باتھ روم میں پھسل گئی۔ اتفاق سے وہ چھٹی کا دن تھا۔ طارق گھر پر ہی موجود تھا۔ فائزہ کی چیخ سن کر وہ باتھ روم کی طرف بھاگا۔

فائزہ کی بری حالت تھی۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ طارق نے ہسپتال فون کر کے ایمبولنس منگوائی۔ ساتھ ہی احمد میاں کو بھی اطلاع دے دی۔

فائزہ دس بارہ گھنٹے موت وزیست کی کش مکش میں مبتلا رہی۔ اس کے بطن سے مردہ بچہ پیدا ہوا' بچے کی پیدائش میں اس قدر پیچیدگیاں بڑھیں کہ اسے ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم کر دیا گیا۔ بس اس کی جان بچ گئی۔ یہی غنیمت تھا۔ فائزہ نے اپنے گھر میں طارق کو کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح ہمیشہ توہین آمیز سلوک روا رکھی تھی' لیکن طارق نے اس سے اپنے گھر میں اس کی تمام تر آوارگیوں کے باوجود اچھا سلوک کیا' رفتہ رفتہ اسے فائزہ سے محبت ہوتی گئی۔

فائزہ شادی کے بعد ایک سال تک ٹھیک رہی۔ خوفزدہ اور ڈری سہمی سی رہی۔ پھر جب اسے طارق کے نرم مزاج کا اندازہ ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ طارق کے گھر میں وہ قطعی محفوظ ہے' اس سے وہ محبت کرنے لگا ہے اور اس نے اس کی سنگین غلطی کو نوعمری کی نادانی سمجھ کر

بلا دیا ہے تو اس کے اندر کی فائزہ نے انگڑائی لی' اس کی پوشیدہ فطرت عیاں ہونے لگی۔ جان محفل بننے کی خواہش' مردوں کو دیوانہ بنانے کا ارمان ایک دم جاگ پڑا۔

طارق ایک نیک طینت اور سوشل مرد تھا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ کئی دوستوں کا گھر میں بھی آنا جانا تھا۔ تاش کی محفل میں فائزہ بھی شامل ہوتی۔

رفتہ رفتہ وہ اس کے ایک دوست کی مرکز نگاہ بن گئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار بادل بن کر چھا گیا۔ آرزوئیں بجلی کی طرح کڑکیں' جذبات کے دریا بہہ نکلے اور وہ دونوں اس جذبات کے طوفان میں ڈوب گئے۔

فائزہ جس آگ کے دریا سے گزر آئی تھی' وہ سب عذاب بھول گئی۔ اس کی ہرجائی فطرت نے شوہر کا اعتبار لوٹا۔ والدین کی عزت

اچھالی مگر وہ مدہوش رہی۔

جانے کتنے دن اور یہ بے وفائی جاری رہتی' جانے کب یہ فریب کا ڈراما چلتا کہ وہ لمحہ آ گیا۔ کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی میں صرف ایک لمحے کا فرق ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں آدمی شیطان سے فرشتہ اور فرشتے سے شیطان بن جاتا ہے اور آج وہی لمحہ فائزہ کا مقدر ہو گیا تھا۔

وہ دوست جو دوستی کے نام پر بدنما دھبا تھا' اسے فائزہ نے خوب ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اب وہ بے وفائی نہیں کریگی۔ اسے سچی محبت دے گی اور ہمیشہ اس کی ہو کر رہے گی۔

وہ روتے روتے اور سوچتے سوچتے سو گئی تھی،

وہ بچپن سے ایک خواب دیکھا کرتی تھی۔ یہ خواب اسے بڑے تسلسل سے نظر آتا تھا۔ وہ دیکھتی کہ کوئی پراسرار عمارت کا اسے صرف

ایک حصہ نظر آتا' پرانے طرز کی اس عمارت میں اسے بے شمار کھڑکیاں اور روشن دان دکھائی دیتے۔ عمارت کے پس منظر میں بادل چھائے ہوتے۔ تب اچانک ایک دروازہ کھلتا اور اس میں انسانی ہیولے نمودار ہونے لگتے۔ ایسا لگتا جیسے انہیں اوپر سے ایک ایک کر کے تیزی سے پھینکا جا رہا ہے۔ ان انسانی ہیولوں کے گرنے کے ساتھ ہی فضا میں چیخوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ یہ بڑی دلدوز چیخیں ہوتیں۔ پھر اچانک اس عمارت کے ایک جانب سے ایک بڑا سا چہرہ ابھرتا۔ یہ ایک مکار عورت کا چہرہ ہوتا۔ فائزہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے' دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے دو زہریلے سانپ نمودار ہوتے اور اپنا پھن لہرانے لگتے۔

فائزہ اس خواب کو دیکھ کر چیخ مار کر اٹھ جاتی۔ یہ خواب وہ سات

سال کی عمر سے دیکھ رہی تھی۔ اب خوبصورت مکار عورت کو جس کی آنکھوں سے دو زہریلے سانپ برآمد ہوتے تھے' فائزہ نہ پہچان پائی تھی۔

پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے خدوخال میں تبدیلی آتی گئی' تو وہ اس عورت کو پہچاننے لگی۔

یہ عورت وہ خود تھی' جب اسے یہ خواب نظر آتا تو وہ سہم کر رہ جاتی۔ اسکی روح کانپ اٹھتی۔ جسم سے جیسے آدھی جان نکل جاتی' یہ بھیانک خواب کبھی مسلسل دو تین دن تک نظر آتا۔ کبھی مہینے دو مہینے بعد اور کبھی اس خواب کو دیکھے سالوں ہو جاتے۔

وہ اس خواب کی جزئیات پر بڑا غور کرتی مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ بچپن میں شائستہ نے اس کے لیے دو ایک تعویذ بھی لیے تھے' لیکن ان تعویذوں کا مذاق اڑاتے۔

سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر رفتہ رفتہ اسے ساری باتیں یاد آ گئیں۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی' پونے بارہ بج رہے تھے۔ طارق ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آنے والا تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی' ابھی اس نے کھانا بھی پکانا تھا۔

باتھ روم میں جا کر اس نے جلدی جلدی منہ پر چھینٹے مارے اور دوپٹے سے ہی منہ صاف کرتی باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

وہ خواب اس نے آج بھی دیکھا تھا۔ وہی پراسرار عمارت کا ایک گوشہ اوپر سے گرتے ہوئے کچھ انسانی ہیولے' دلدوز چیخیں' عمارت کے ایک جانب سے ابھرتا ہوا اس مکار عورت کا چہرہ۔ اس کا کن آکھیوں سے دیکھنا۔ سب کچھ وہی تھی' لیکن آج تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی تھی۔ آج فائزہ نے اس کی آنکھوں سے دیکھنا۔ سب کچھ وہی تھی'

لیکن آج تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی تھی۔ آج فائزہ نے اس کی آنکھوں سے سانپ نکلتے نہیں دیکھے تھے۔ آج اس نے اس کی آنکھوں میں سانپوں کے بجائے شمع روشن ہوتے دیکھی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس خواب کو دیکھ کر وہ بالکل نہ کانپی تھی۔ نہ اس کی جان نکلی تھی' اس کی آنکھوں میں شمع روشن دیکھ کر اس کی روح پر ایک اطمینان سا چھا گیا تھا۔

''وہ بڑے خوشگوار موڈ میں کھانا پکانے میں مصروف تھی' روح پر سرشاری سی طاری تھی۔ نمک چکھ کر وہ باورچی خانے سے نکلی اور کیسٹوں کے ریک سے ایک خوبصورت گانوں کا کیسٹ نکالا اور اسے کیسٹ پلیئر میں لگا کر آواز خاصی اونچی کر دی۔ پھر وہ جھومتی ہوئی کچن میں آئی اور ہنڈیا روٹی میں لگ گئی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب گھنٹی کی مخصوص آواز آئی' طارق آ گیا تھا۔

اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولی ''اتنی دیر لگا دی۔''

''اتنی دیر کہاں؟ ....ایک بجے دفتر سے اٹھا تھا۔ وہ سیدھا چلا آرہا ہوں' ہاں وہ کھانے کا کیا ہوا؟ طارق نے پلٹ کر دروازہ بندہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کھانا تیار ہے جناب۔'' فائزہ نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔

''بس ٹھیک ہے' کھانا نکالو.........میں منہ دھو کر آتا ہوں۔''

طارق جب فارغ ہو کر کھانے کی میز پر آیا تو فائزہ اس وقت کھانا چن چکی تھی۔ فائزہ نے آج بڑا دل لگا کر کھانا تیار کیا تھا۔ یہی شوق کھانے میں لذت بن کر تحلیل ہو گیا تھا۔

طارق نے کھانے میں یہ لذت بطور خاص محسوس کی' اس نے پوری دلچسپی سے کھانا کھایا اور ساتھ ہی کھانے کی تعریف بھی کرتا رہا۔

پھر چائے پینے کے بعد بولا۔

''میں تھوڑا آرام کر لیتا ہوں۔ تم جب تک نہا دھو کر تیار ہو جائے' پھر گھر سے نکلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ویسے پروگرام کیا ہے؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''پروگرام یہ ہے کہ پہلے چلیں گے تمہاری امی کے گھر۔ ایک آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھ کر پھر گھومنے نکل جائیں گے' تمہاری کسی پسند کی جگہ۔ رات کو کسی چائنیز ریستوران میں کھانا' اس کے بعد فلم کا آخری شو اور پھر گھر۔ یہ ہے پروگرام۔''

''شاندار۔'' فائزہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''امی کے گھر جانا کیا ضروری ہے؟''

''ہاں ضروری ہے۔ ماموں جان سے پورے ایک ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''پر ابو........اس وقت گھر پر کہاں ہوں گے۔''

''گھر پر ہی ہیں' میں نے انہیں فون کیا تھا' اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دی ہے۔''

''گھر پر وہ کیا کر رہے ہیں؟ وہ تو کبھی ہوتے نہیں اس وقت!''

''کچھ سر وغیرہ میں درد تھا' لہٰذا آرام کر رہے ہیں۔''

''اچھا........پھر تو جانا ضروری ہے۔'' فائزہ نے کھانے کی میز سے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

فائزہ کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہ تھا' وہ ساری میں کچھ اور دلکش ہو جاتی۔ ساری اسے بہت اچھی لگتی تھی' ویسے بھی اسے ساری باندھنے کا سلیقہ تھا۔ اس وقت بھی جب وہ تیار ہو کر طارق کے سامنے آئی تو وہ چند لمحے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کالی اور سرخ ساری میں دلفریب لگ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہیں اتنے غور سے۔'' فائزہ نے ساری کو پلو درست کرتے ہوئے کہا۔

فائزہ کا حسن دیکھ رہا ہوں۔'' طارق کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ ''تم کس قدر حسین ہو فائزہ۔''

''ہاں' وہ تو میں ہوں۔'' فائزہ نے دلبری سے کہا۔ طارق اس جواب پر مسکرا پڑا۔

''پھر چلیں؟''

'جی بالکل۔'' فائزہ نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

طارق نے گھر کو لاک کیا' فائزہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔

نیچے اترے تو اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جو ابھی خالی

ہوئی تھی، وہ فوراً اس میں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی جب احمد میاں کے دروازے پر رکی تو ٹیکسی کی آواز سن کر شائستہ باہر نکل آئیں، انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کو بڑے چاؤ سے ٹیکسی سے اترتے دیکھا۔ فائزہ اندر آئی تو اسے بھینچ کر دل سے لگایا۔ طارق کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

''ابو کہاں ہیں امی؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''میں یہاں ہوں بیٹی۔'' احمد میاں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''ارے ماشاءاللہ آج تو ہماری بیٹی کمال کی لگ رہی ہے۔''

''کمال کی نہیں ابو........احمد میاں کی۔'' فائزہ نے جلدی سے جواب دیا۔

اس جملے پر سب نے زور دار قہقہہ لگایا۔

پھر شائستہ نے دونوں کو سالگرہ کی مبارک باد دی۔ فائزہ نے

اپنے ابو کا حال پوچھا جس پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے کوئی بات نہیں بیٹی۔ ایسے ہی سر میں درد تھا۔ تمہاری امی کو فوراً موقع مل گیا اور یوں ہماری چھٹی ہو گئی۔''

''امی نے آپ کو کہیں لے جانا ہو گا۔'' فائزہ نے شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں امی کہاں جانا ہے؟ شاپنگ یا ہوٹلنگ یا پھر پکنک؟ بولیں''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' طارق نے کہا۔

''اور بیٹے طارق، تم سناؤ کیا حال ہیں، پورے ایک ہفتے بعد تمہاری شکل دکھائی دی ہے۔''

''ابو جان........یہی بات یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ماموں جان سے ملے ایک ہفتہ ہو گیا، ملنے کو جی چاہ رہا تھا یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

طارق تمہاری یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ تم شادی کی سالگرہ گھر پر موم بتی بجھا کر نہیں مناتے بلکہ پورے دن گھومتے پھرتے ہو۔ بیگم کیا خیال ہے، ہم بھی کیوں نہ آج اپنی شادی کی شالگرہ باہر جا کر منالیں۔''

''آپ کون سی شادی کی سالگرہ منائیں گے۔ آپ سے میری شادی تو جنوری میں ہوئی تھی۔ ادھر ابھی اکتوبر شروع ہوا ہے ہاں اکتوبر میں کوئی شادی ہو تو مجھے معلوم نہیں۔'' شائستہ نے احمد میاں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

اسی طرح کی خوش گپیوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب طارق نے ان سے اجازت چاہی، احمد میاں دونوں کو باہر تک چھوڑنے آئے اور انہیں رخصت کرتے ہوئے بولے۔

''بیٹے، باہر زیادہ دیر تک نہ رہنا۔''

''ماموں جان'' آپ فکر نہ کریں۔ اچھا خدا حافظ۔''

یہاں سے انہوں نے سمندر کی طرف رخ کیا۔ فائزہ کو سمندر بہت اچھا لگتا تھا' اس کا جی چاہتا کہ وہ گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھی آتی جاتی لہروں کو گنتی رہے۔ فائزہ سے زیادہ طارق کو سمندر سے عشق تھا۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر یہ ناممکن تھا کہ وہ بغیر نہائے وہاں سے واپس چلا جائے۔ سمندر کے نیلے پانی کو دیکھتے ہی اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ لہریں جیسے اس کا نام لے کر پکارتیں اور وہ ان سے ہم آغوش ہونے کے لیے سمندر میں کود پڑتا۔

وہ شام تک سمندر کی لہروں سے کھیلتے رہے' ایک دوسرے پر پانی اچھالتے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔ سورج غروب ہونے پر انہوں نے وہاں سے کوچ کیا اور شہر کے ایک مشہور چائنیز ریستوران میں ڈنر کیا۔

ریستوران کی مدھم مگر خوشگوار فضا میں وہ بیتے دنوں کو دہراتے رہے۔ طارق ماضی کی یادوں کو راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح کرید رہا تھا اور فائزہ ماضی کے قصوں سے جلد جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اسے اب ماضی سے زیادہ مستقبل سے دلچسپی تھی۔ ماضی اس کے لیے ببول کا کانٹا بن گیا تھا۔ جسے جتنا نکالو' اندر گھستا ہی جاتا ہے۔ وہ مستقبل کے خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ طارق کی باتیں بظاہر بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی' لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔

''فائزہ!'' اس نے اسے چونکایا۔

''جی۔'' وہ واقعی چونک گئی۔

''ایک بات بتاؤ فائزہ۔'' طارق نے بڑے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات؟'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''کیا اس زندگی میں ہی کیے کی سزا مل جاتی ہے؟''

مجھے معلوم نہیں طارق۔ ہو سکتا ہے' مل جاتی ہو' ویسے اتنا ضرور یقین ہے کہ اوپر ضرور سزا ملے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ اللہ زندگی میں ہی سزا دے دیتا ہے۔ اسے ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں' یہ الگ بات ہے' رہی بات اوپر کی' وہ تو خیر ٹھکانا ہے۔ وہاں بھی اگر جزا سزا نہ ملی تو پھر کہاں ملے گی۔ میں تو اس دنیا کو ہی انسان کے لیے ایک سزا سمجھتا ہوں۔''

ہاں' شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ فائزہ نے کہا ''اس زندگی میں ہم کتنے عذاب جھیلتے ہیں' کتنے دکھ اٹھاتے ہیں' سکھ یو یہاں صرف چند لوگوں لو ملتا ہے یا شاید انہیں بھی نہیں۔''

''سکھ کا نام اگر پیسہ ہے تو وہ یہاں بہت لوگوں کے پاس ہے......''

نہیں، سکھ کا نام پیسہ ہرگز نہیں۔ اگر سکھ کا نام پیسہ ہوتا تو ہر پیسے والا خوش و خرم ہوتا، پرسکون ہوتا۔"

"پیسہ تو سکون کا دشمن ہے۔"

"ہاں، یہ بات سو فیصد صحیح ہے، لیکن یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آئے گی نہیں۔ "تم ٹھیک کہتے ہو؟"

"میں بات کر رہا تھا کیسے کی سزا کی۔ فائزہ، تم ایک بیوی ہو تم اس مسئلے پر اچھی طرح روشنی ڈال سکو گی۔ آج صبح دفتر میں کسی مرد اور عورت کی بے وفائی پر بات ہو رہی تھی۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی۔ عورتوں کی نظر میں مرد بد فطرت ہوتا ہے، لڑکی دیکھ کر پھسلنے والا۔ چلو مان لیتا ہوں، لیکن تم ذرا ان شادی شدہ عورتوں کی نفسیات پر روشنی ڈالو جو اپنے شوہر کو چھوڑ کر غیر مرد کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں۔ عورتیں تو بد فطرت نہیں ہوتیں، پھر وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟"

''انتقاماً.........میں سمجھا نہیں! وہ بے وفائی کر کے کس سے انتقام لیتی ہیں؟''

''اپنے شوہر سے۔''

''یہاں' محبت کرنے والے شوہر کا ذکر نہیں۔''

''اچھا فرض کرو' ایک شوہر ہے اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے۔ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتا ہے' لیکن اس کی بیوی پھر بھی کسی سے دامن الجھا لیتی ہے۔ اب تم.........''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' فائزہ نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہنا چاہی' لیکن اس کے لہجے میں اعتماد نہ آ سکا۔ اس کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

''اگر ایسا ہو جائے تو شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟''

''اسے طلاق دے دینی چاہیے۔''

''بس' طارق......... یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی۔ شوہر کی عزت کو داؤ پر لگانے والی عورت کو اتنی سی سزا! طلاق ایسی عورت کے لیے سزا نہیں' جزا ہے۔'' طارق بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

''طارق' آج کے دن یہ کیا لے بیٹھے!'' فائزہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی۔

''اوہ' سوری۔'' طارق فوراً سنبھل گیا۔ اچھا' اب جلدی کھانا کھاؤ۔ پکچر کا وقت نہ نکل جائے۔''

''نہیں' وقت نہیں نکلے گا۔ انگلش فلم تو ویسے بھی دیر سے شروع ہوتی ہے۔''

کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ پکچر ہاؤس پہنچے تو فلم کے ٹائٹل چل رہے تھے۔ ٹارچ مین نے ان کی نشستوں تک رہنمائی کی' طارق نے سیٹ پر بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔

''ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔'' فائزہ نے کہا۔

''ہاں۔'' طارق نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''فلم کا ایک سین بھی نکل جائے تو مجھے بڑی بوریت ہوتی ہے۔''

''جانتی ہوں۔ اسی لیے تو ڈر رہی تھی کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

یہ فلم بھی اتفاق سے ازدواجی زندگی پر تھی۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جو اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے' کسی اور کی ہو جاتی ہے' لیکن آخر میں وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹ آتی ہے۔

اس فلم کو دیکھتے ہوئے فائزہ انگاروں پر لوٹتی رہی' اس فلم کا ہر سین اس کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدلتی' کن انکھیوں سے طارق کی طرف دیکھتی اور پھر اسکرین پر نظریں جما دیتی۔ اس فلم کا انجام دیکھ کر وہ بے اختیار سسک پڑی' اس نے وفور جذبات سے طارق کا ہاتھ دبایا۔

''میں تمہاری ہوں طارق..........صرف تمہاری۔'' اس کی روح کی نادم مگر دھیمی آواز آئی' پر یہ آواز طارق تک نہ پہنچ سکی۔

فلم کے اختتام پر وہ دونوں آہستہ آہستہ سینما ہال سے باہر نکلے۔ رکشا' ٹیکسی کا دور تک پتا نہ تھا۔ طارق اور فائزہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سواری کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دو منٹ کے بعد سڑک کے اس پار پٹرول پمپ پہ ایک ٹیکسی آ کر رکی' ٹیکسی خالی تھی وہ اسے دیکھ کر بھاگا۔

''فائزہ تم یہیں کھڑی ہو۔ میں ٹیکسی والے سے بات کرتا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' فائزہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

فائزہ نے طارق کو سڑک پار کرتے دیکھا۔ وہ بھاگ کر ٹیکسی کے قریب پہنچا۔ چند لمحے ٹیکسی والے سے بات کی پھر اس نے طارق کو

ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا' اسے ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ کراس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ٹیکسی والے کا مان جانا بھی کسی محبوب کے مان جانے سے کم نہیں ہوتا۔

چند سیکنڈوں کے بعد ٹیکسی فائزہ کے سامنے آ کر رکی۔ فائزہ دروازہ کھول کر طارق کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چلنے سے پہلے بغور انہیں دیکھا۔

''اس فلم کا انجام بہت اچھا تھا۔ فائزہ نے تبصرہ کیا۔

''ہاں' بڑا اصلاحی تھا۔'' طارق کے لہجے میں بڑا طنز تھا اور اس بات کی تنبیہہ بھی کہ وہ مزید اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

فائزہ اس کے لب و لہجے کو اچھی طرح سمجھتی تھی لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کی۔

ٹیکسی اب شہر سے نکل چکی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں' کبھی ایک

آدھ گاڑی نظر آجاتی۔ٹیکسی ڈرائیور نے منی بیگم کی غزلوں کی کیسٹ لگادی تھی جسے وہ دونوں بھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔

ٹیکسی پل پر پہنچی تو طارق نے دیکھا کہ دو آدمی سڑک پر کھڑے ہیں۔نزدیک ہی ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے۔وہ دونوں ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کررہے تھے۔

وہ دونوں آدمی ظاہر ہے کہ کوئی اچھے آدمی نہیں ہوسکتے تھے اس لیے طارق ٹیکسی کو آہستہ ہوتے دیکھ کر فوراً چیخا۔''گاڑی مت روکنا۔''

لیکن ٹیکسی والے نے اس کی بات پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے گاڑی روک لی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں آدمی نزدیک آتے' ٹیکسی ڈرائیور پیچھے مڑا اور طارق کو ریوالور دکھاتے ہوئے بولا۔''چلو نیچے اترو۔''

''یہ کیا بکواس ہے!''

"یہ بکواس نہیں ریوالور ہے اور بھرا ہوا ہے۔"

فائزہ آج گھر سے پوری طرح دلہن بن کر نکلی تھی۔ اس کے جسم پر خاصا زیور تھا۔ وہ طارق سے چمٹ گئی۔

اتنے میں وہ دونوں غنڈے بھی قریب آ گئے اور دروازہ کھول کر طارق کو باہر کھینچنے لگے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" طارق کو غصہ آ گیا۔

"باہر نکلو گدھے ورنہ ابھی گولی چلاتا ہوں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

فائزہ سہم گئی۔ اس نے اور مضبوطی سے طارق کو پکڑ لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں، خدا کے واسطے میرے شوہر کو کچھ نہ کہنا۔"

تب ایک غنڈہ دروازے کے دوسری طرف گیا۔ اس نے ایک

جھٹکے سے فائزہ کو طارق سے الگ کیا۔ اس اثنا میں ٹیکسی ڈرائیور نے
دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر طارق کو ٹانگ اور ہاتھ پکڑ کو باہر گھسیٹ
لیا‘ فائزہ نے تڑپ کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔

’’طارق!‘‘ وہ چیخی۔

فائزہ کی چیخ سن کر وہ ان دونوں سے الجھ گیا‘ لیکن اس ہاتھاپائی کا
کوئی نتیجہ نہ نکلا‘ سوائے اس کے کہ طارق لہولہان ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور
نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے
تارے ناچ گئے۔ پھر اس نے دھندلاتی آنکھوں سے اتنا دیکھا کہ
ٹیکسی ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا اس کا دوسرا ساتھی بھی پیچھے بیٹھ گیا اور
فائزہ کو قابو کرنے میں اپنے پہلے ساتھی کی مدد کرنے لگا جسے فائزہ نے
کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ پھر گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔

فائزہ بری طرح چیخ رہی تھی‘ وہ ’’طارق‘ طارق‘‘ پکار رہی تھی اور

طارق کی آنکھوں میں اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔اس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ٹیکسی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے دور وہ چکرا کر زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

حواس کھوتے ہی جیسے فائزہ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بڑے پر درد لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میں تمہاری ہوں طارق۔ مجھے بچالو۔''

لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ ہونی ہو چکی تھی، ہونی کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہاں سے ایک ٹرک گزرا ٹرک ڈرائیور کی نظر جب طارق پر پڑی جو ایک لاش کی مانند پل پر پڑا تھا تو اس پٹھان ڈرائیور کے دل میں جذبہ رحم جاگا' اس نے ٹرک روک لیا۔

پھر وہ ٹرک سے کودا۔ پٹھان ڈرائیور نے اپنے گلے میں پڑے

ہوئے ریوالور کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا اور پھر اطمینان سے طارق کی طرف بڑھا۔

طارق اوندھے منہ سڑک پر پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر پیشانی پر آ گیا تھا۔ ڈرائیور نے جھک کر اس کا معائنہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

''ابھی زندہ ہے۔ اٹھاؤ اسے ٹرک میں ڈالو۔ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا ہے' اسے شاید کسی نے لوٹا ہے۔''

پھر دونوں نے مل کر اسے اٹھا کر ٹرک میں ڈالا۔

''استاد اسے کہاں لے جاؤ گے؟''

''اوئے۔ ہسپتال لے جائیں گے اور کدھر لے جائیں گے۔''

ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی طارق کو ہوش آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر گھبرا کر ٹرک سے

چھلانگ لگانے لگا۔

''ذرا ہوش کرو یار۔ تم پہلے ہی زخمی ہے' چھلانگ لگا کر کیوں مرتا ہے۔''

''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ کون ہو تم لوگ؟''

''ارے ہم لوگ ٹرک ڈرائیور ہے اور کون ہے۔ تم سڑک پر بے ہوش پڑا تھا' ہم نے اٹھایا۔ بس یہی ہے ہمارا قصور۔''

''خان صاحب۔ وہ میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے''

''تم اتنی رات کو بیوی کو لے کر نکلا کیوں؟''

''خان صاحب' ہم فلم دیکھ کر آ رہے تھے اور گھر جا رہے تھے'' پھر طارق نے ساری روداد ٹرک ڈرائیور کو سنا دی' کیا ہوا اور کیسے ہوا۔

ٹرک ڈرائیور نے اسے تسلی دی' پہلے ہسپتال میں اس کی مرہم پٹی کرائی پھر اسے تھانے کے گیٹ پر چھوڑ دیا۔ اپنا نام پتا بھی اس نے بتا

دیا کہ اس کی ضرورت پڑے تو اسے بلا تکلف یاد کر لینا۔

تھانے میں نے اغوا کی رپورٹ درج کرائی۔ وہیں سے احمد میاں کو فون کیا۔ پانچ چھ گھنٹیاں بجنے کے بعد انہوں نے فون اٹھایا' چند لمحوں بعد احمد میاں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

ماموں جان میں بول رہا ہوں۔" طارق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس خبر کو سنائے

"ارے طارق! تم خیریت تو ہے" احمد میاں کی فوراً نیند اڑ گئی۔

"ماموں جان" بہت بری خبر ہے۔ فائزہ کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا۔" طارق نے بہ مشکل خبر سنائی۔" ماموں جان' میں اس وقت تھانے میں ہوں' آپ فوراً یہاں آ جائیے۔"

تھانے کا انچارج معصوم شاہ بڑا شریف النفس آدمی تھا۔ اس نے طارق کو بڑی تسلی دی۔ اچھی طرح پورے واقعات سنے۔ رپورٹ

درج کی پھر وائرلیس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی۔ جہاں سے تمام شہر کی پولیس کو چوکس کر دیا گیا۔ ناکہ بندی کر دی گئی۔

ابھی وہ رپورٹ درج کرا ہی رہا تھا کہ احمد میاں' اپنی بیگم کے ساتھ تھانے پہنچ گئے۔ طارق کے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر وہ دونوں بے قرار ہو گئے۔ احمد میاں نے اسے لپٹا لیا۔

طارق نے ایک مرتبہ پھر ٹیکسی میں بیٹھنے سے لے کر تھانے پہنچنے تک کے واقعات دہرائے۔

معصوم شاہ نے بہت غور سے اس کا بیان سنا۔ اس کا بیان حرف بہ حرف وہی تھا جو وہ رپورٹ میں لکھوا چکا تھا۔

''کیا آپ کو ٹیکسی کا نمبر یاد ہے؟'' معصوم شاہ نے سگریٹ کا گل جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں' میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔''

’’اس ٹیکسی ڈرائیور کو پہچان لیں گے؟‘‘

’’ہاں‘ اسے میں فوراً پہچان لوں گا۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔‘‘

’’اور اس کے ساتھیوں کو؟‘‘

’’ان کے چہرے بھی مجھے یاد ہیں۔‘‘

معصوم شاہ اسی طرح کے رسمی سوالات کرتا رہا۔ پھر بولا۔

’’اچھا ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اب جائیں‘ جیسے ہی کوئی اطلاع ملے گی میں آپ کو فون پر بتا دوں گا۔ ویسے آپ لوگ فکر نہ کریں وہ ضرور مل جائے گی۔‘‘

’’خدا کرے‘ ایسا ہی ہو۔‘‘ طارق نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

شائستہ کی حالت خاصی خراب ہوگئی تھی۔ ان پر نیم غشی سی طاری تھی۔ طارق نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا اور باہر کی طرف چلا۔

اب طارق کا اپنے گھر جانا فضول تھا' وہاں کون بیٹھا تھا جس کے لیے جاتا۔ وہ احمد میاں کے ساتھ آ گیا۔ شائستہ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی' یوں احمد میاں بھی نڈھال ہو رہے تھے۔ طارق کی جو حالت تھی' وہ خود ہی جانتا تھا۔ سر پر تو خیر چوٹ پڑی ہی تھی' لیکن دل پر جو چوٹ پڑی تھی وہ خاصی کاری تھی۔ اس میں شدید تکلیف تھی۔ لٰہذا وہ ماموں جان کے گھر ہی ٹھہر گیا۔

وہ رات تقریباً آنکھوں میں کٹی۔ کوئی نہ سو سکا۔ سوتا بھی کیسے' بیٹی کا اغوا ہو جانا' بیوی کا چھن جانا' ایک کربناک حادثہ تھا۔ والدین کے لیے بھی اور شوہر کے لیے بھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پر سب کے کان لگے رہے۔ تھانے سے کوئی فون نہ آیا البتہ رانگ نمبر آتے رہے' لیکن صورتحال ہنوز وہی تھی۔ پولیس ابھی تک کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔

صبح اذان کے وقت طارق کی آنکھ لگ گئی' لیکن شائستہ بالکل نہ سو

سکیں۔ ادھر احمد میاں کا بھی یہی حال تھا۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر انہوں نے رات کاٹی۔ وہ صبح گاڑی لے کر نکل گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی گھنٹی کی آواز سے طارق کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو۔'' وہ بے قراری سے بولا۔

شائستہ بھی اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں اور پر امید نظروں سے طارق کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''ہیلو۔ جلترنگ میرج ہال۔'' ادھر سے آواز آئی۔

یہ سن کر طارق بھنا اٹھا' اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور بولا۔

''گدھے کا بچہ۔''

''کون تھا طارق؟''

''رانگ نمبر تھا ممانی جان۔''

''ایک ان رانگ نمبروں نے بڑی مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ خدا سمجھے انہیں۔''

''ماموں جان کہاں ہیں؟'' طارق نے پوچھا۔

''گاڑی لے کر کہیں نکلے ہیں۔'' شائستہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک خفیہ پولیس کا افسران کا جاننے والا ہے' ممکن ہے' اس کے گھر گئے ہوں۔''

''کچھ بتا کر نہیں گئے؟''

''نہیں۔'' شائستہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب احمد میاں واپس آئے۔ وہ واقعی اپنے واقف کار خفیہ پولیس افسر خورشید احمد کان کے پاس گئے تھے۔ اس نے تعلقات کی لاج رکھتے ہوئے' ادھر ادھر فون کھڑکائے' معصوم شاہ سے بھی تازہ صورتحال معلوم کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مایوسی کے سوا کچھ نہ

آئینہ کا راز

ایک عاشق کی داستان حیرت۔ اس کی
محبوبہ نے جب اپنے مجسم حسن پر نظر ڈالی
تو اچانک اس کا خوب صورت چہرہ خوف
و دہشت کی آماجگاہ بن گیا اور وہ چلاتی پھر
رہی تھی کہ یہ میرا عکس نہیں ہے۔

ملا۔

اسی تذبذب میں پریشانی کے عالم میں، آس نراش میں چوبیس گھنٹے مزید گزر گئے۔

دوسرے دن ٹھیک آٹھ بجے معصوم شاہ کا ٹیلی فون آیا۔ ٹیلی فون احمد میاں نے اٹھایا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹیلی فون ان کے لیے کیا خبر لایا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو وہ ہرگز ٹیلی فون نہ ریسیور کرتے۔

ادھر سے معصوم شاہ ایک اندوہناک خبر سنا رہا تھا اور احمد میاں کے جسم میں کپکپاہٹ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ تب انہوں نے ریسیور طارق کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دل تھام کر بیٹھ گئے۔

"ہائے میری بچی۔"

فائزہ کی لاش مل گئی تھی۔ معصوم شاہ اس وقت ہسپتال سے بول رہا

تھا۔اس نے دونوں کو بلایا تھا تاکہ آ کر لاش لے جائیں۔

جب ایمبولینس میں لاش کو لایا گیا تو تمام عزیز و اقارب اکٹھے ہو چکے تھے۔لاش کو دیکھ کر ایک کہرام سا مچ گیا۔شائستہ ''ہائے میری بچی'' کہہ کر غش کھا کر گریں۔طارق اپنے پھٹے سر کو دیوار سے ٹکرانے لگا۔اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔البتہ احمد میاں پر سکتہ طاری تھا۔وہ چپ چاپ لاش کے پاس بیٹھا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

جب فائزہ کا آخری سفر شروع ہوا تو احمد میاں کے اندر تھما ہوا طوفان ایکدم ابل پڑا۔وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔فائزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت چہیتی۔شائستہ پر متواتر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔وہ چند منٹ کے لیے ہوش میں آتیں۔

''ہائے میری بچی'' کہتیں اور پھر بے ہوش ہو جاتیں۔

فائزہ کی جوان موت سب کے دکھ کا باعث تھی، لیکن خالق کے آگے کس کی چلی ہے۔ جو دیتا ہے، وہ لینا بھی جانتا ہے، جو جلاتا ہے وہ مارنا بھی جانتا ہے، اس کی مصلحتوں کے آگے بندے کا سر جھکا دینا ہی بہتر ہے۔

فائزہ کے جنازے میں خاصے لوگوں نے شرکت کی۔ ان بہت سے لوگوں میں خورشید احمد خان اور معصوم شاہ بھی شامل تھے۔ موصوم شاہ سادہ لباس میں تھا۔ اس اثنا میں اس نے بہت سی معلومات اکٹھا کر لی تھی۔

یہ معلومات فائزہ کے متعلق بھی تھیں اور طارق کے متعلق بھی۔ ان معلومات میں ایک بات بڑی چونکا دینے والی تھی۔ اس سراغ کی روشنی میں معصوم شاہ اور خورشید احمد خان نے ازسرنو کیس کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کی روشنی میں انہیں مجرم کسی حد تک نظر آنے لگا۔ پھر

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس فیصلے پر مزید مہر ثبت کی۔

دوسرے دن معصوم شاہ' احمد میاں کے گھر آیا۔ ساتھ دو سپاہی تھے۔

گھنٹی بجانے پر شائستہ باہر آئیں تو معصوم شاہ نے بڑے مہذبانہ انداز میں پوچھا۔ ''طارق صاحب کہاں ہیں؟''

''طارق تو اپنے گھر گئے ہوئے ہیں' میں نے ہی انہیں بھیجا تھا تا کہ کپڑے وغیرہ تبدیل کرلیں۔ بہت میلے ہو گئے تھے۔ اب جانے والی تو چلی گئی۔ اس کے ساتھ آدمی خود تو مٹی نہیں ہو جاتا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''احمد میاں بھی گھر پر نہیں؟''

'جی نہیں۔ وہ طارق کو گھر چھوڑنے گئے ہیں۔''

''آپ مجھے طارق صاحب کے گھر کا پتا بتانا پسند کریں گی؟''

''جی ہاں' کیوں نہیں۔'' پھر انہوں نے تفصیل سے طارق کے گھر کا پتا بتایا اور آخر میں بولیں۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''جی ہاں' بالکل خیریت ہے۔ ذرا ان سے کچھ بات کرنا تھی۔ اچھا جی' بہت شکریہ۔ ہم چلتے ہیں۔''

''جی بہتر۔'' شائستہ نے انہیں ''خدا حافظ'' کہا اور گیٹ اندر سے بند کر لیا۔

طارق کے گھر پہنچنے میں معصوم شاہ کو آدھا گھنٹا لگا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ دروازے پر لگی نام کی تختی کو پڑھا اور پھر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ طارق نے معصوم شاہ کو مع دو سپاہیوں کے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا تو ایک لمحے کو چکرا گیا پھر اس نے اپنی بدلتی کیفیت کو تیزی سے کنٹرول کیا اور مسکراتے ہوئے

بولا۔ ''آیئے۔ انسپکٹر صاحب' آیئے۔''

''احمد میاں کہاں ہیں؟'' معصوم شاہ نے ڈرائینگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا تو آپ ادھر سے آ رہے ہیں۔'' طارق نے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ''ماموں جان تو مجھے نیچے ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''طارق صاحب' آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔'' معصوم شاہ نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی' لیکن طارق اندر ہی اندر چوکنا ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''آپ نے بھئی' بڑی زبردست پلاننگ کی۔''

''کس بات کی؟''

''اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اور کس بات کی۔''

اچانک حملہ ہوا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! انسپکٹر صاحب' آپ نشے میں تو نہیں ہیں۔'' طارق نے اپنے حواس کو منتشر ہونے سے روکا۔

معصوم شاہ نے اس کی بات کو بالکل برا نہیں مانا۔ جان کر سرد مزاجی کا مظاہرہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تو خیر نشے میں نہیں ہوں اور نشہ تو بڑی چیز ہے میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔''

''پھر اس طرح کا الزام مجھ پر تھوپنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟''

''آپ نے بہت سی باتیں ہمیں بتائیں مگر جو اصل بات تھی' وہ چھپا گئے۔''

''مثلاً؟'' طارق اندر ہی اندر سمٹ رہا تھا۔

''مثلاً یہ بات کہ آپ نے اپنی بیوی کی پانچ لاکھ کی انشورنس

کرائی تھی۔''

''اس بات کا اس کیس سے کیا تعلق ہے۔''

''انشورنس آپ نے کرائی یا نہیں؟ مجھے صرف اس بات کا جواب چاہئے۔''معصوم شاہ کے لہجے میں تھوڑی سی سختی آ گئی۔

''یہ بات بالکل ٹھیک ہے' لیکن........''

''آپ کا کیا خیال ہے' فائزہ کو کیوں قتل کیا گیا؟''

''اغوا' ڈکیتی' مجرمانہ حملہ اور پھر قتل۔'' طارق نے تجزیہ کیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کہتی ہے کہ مقتولہ پر کوئی مجرمانہ حملہ نہیں ہوا۔''

''زیورات تو لوٹے گئے۔ اس کے جسم پر خاصے قیمتی زیورات تھے۔'' طارق نے کہا۔

''کیا مالیت رہی ہو گی ان زیورات کی؟''

’’ساٹھ ستر ہزار۔‘‘

’’اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ زیورات بھی نہیں لوٹے گئے تو۔‘‘

’’لیکن فائزہ کے جسم پر تو ایک بھی زیور نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھ میں انگوٹھیاں بھی نہیں تھیں۔‘‘

’’آپ کی بیوی کا سارا زیور تھانے میں موجود ہے۔ میں نے قصداً آپ کو اور احمد میاں کو اس سے لاعلم رکھا مگر خورشید احمد خاں کو بتا دیا تھا اور اسی بات نے ہمیں دوسری طرف سوچنے پر مجبور کیا۔ اگر آپ کی بیوی کو زیورات کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس کے جسم سے زیورات غائب ہونے چاہئیں تھے۔ پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا کہ مجرمانہ حملہ بھی نہیں ہوا۔ اگر اس ٹیکسی ڈرائیور کو مقتولہ پسند آ گئی تھی تو صاف کیوں چھوڑ دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ان کا مقصد محض اسے قتل کرنا تھا۔ لہٰذا وہ اسے کہیں نہیں لے گئے۔ ٹیکسی

میں ہی گولی اس کے سر پر ماری اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں لاش پھینک کر چلے گئے۔ زیورات وغیرہ پر انہوں نے توجہ نہیں دی۔ توجہ دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ بدمعاش لوگ اصول کے بڑے کھرے ہوتے ہیں۔ کام بڑی دیانت داری سے کرتے ہیں۔ آپ نے تو ان سے صرف قتل کرنے کا سودا کیا تھا نا۔ ظاہر ہے' آپ کو پانچ لاکھ ملنے والے ہیں۔ اس میں سے ڈھائی لاکھ بھی قاتلوں پر خرچ کر دیئے جائیں' پھر بھی آپ فائدے میں رہیں گے۔ کیوں طارق صاحب' میں نے غلط تو نہیں کہا۔'' معصوم شاہ نے ڈنڈے کو اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے طارق کو تیز نظروں سے دیکھا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' طارق نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا' یہ جھوٹ ہے تو پھر تھانے چلیں۔ وہاں دودھ کا دودھ اور

پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' معصوم شاہ نے کھڑے ہوئے کہا۔

پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔'' چلو بھئی' صاحب کو اٹھا کر ڈالو گاڑی میں۔اب بات وہیں ہو گی۔''

دونوں سپاہیوں نے بہ آسانی اسے قابو کر لیا۔'' چل اوئے بیوی کے قاتل۔''

''میں گھر کو بند تو کر دوں۔''

'ہاں' بند کر دو۔ویسے چاہو تو اس گھر کی ہر چیز پر حسرت کی نظر ڈال لو' کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد واپس نہ آسکو گے۔پھانسی تمہارا مقدر ہو گئی ہے۔''

طارق نے کانپتے ہاتھوں سے گھر بند کیا' چابی جیب میں ڈالی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ایک سپاہی کو اس کا یہ نخرا پسند نہ آیا۔ اس نے پیچھے سے اسے دھکا دیا۔'' جلدی اتر اوئے شریف

بدمعاش۔''

طارق سیڑھیوں پر گرتے گرتے بچا۔

''اقبال پتر' ایسا نہ کر' ابھی اس سے اقبالی بیان لینا ہے۔ ذرا چوٹ سے بچا۔'' معصوم شاہ نے اسے سپاہی کے کندھے پر ہاتھ رکھا جس نے دھکا دیا تھا۔

''شاہ جی' بغیر چوٹ کھائے یہ کچھ نہیں قبولے گا۔''

''قبولے گا کیوں نہیں پتر۔ تھانے میں اچھے اچھوں کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ یہ تو پھر پچھر ہے۔''

گاڑی میں بیٹھ کر معصوم شاہ' طارق کو جیسے بھول گیا۔ وہ اپنے ساتھ آئے دونوں سپاہیوں سے گفتگو کرتا رہا اور اس گفتگو کا موضوع تھا اقبال جرم کرانا۔ اقبال جرم کے لیے پولیس کیا کیا کرتی ہے۔ یا کیا کیا کر سکتی ہے' اس کا ذکر اس ڈرامائی انداز سے شروع کیا کہ طارق کی

روح فنا ہونے لگی۔ اس کے سر پر پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ کچھ اور کرنے کے بجائے محض اس کی چوٹ کو چھیڑ دیا جاتا تو وہ سب کچھ بتا دیتا۔ پولیس نے ویسے بھی اس عامل کی طرح ہوتی ہے جو جن اتارنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بے چارہ جن..........اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنی سات پشتوں کی تاریخ بیان کر دیتا ہے۔

تھانے پہنچنے تک معصوم شاہ نے طارق کو محض اپنی باتوں سے ادھ موا کر دیا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

تھانے پہنچ کر طارق نے ایک ٹیلیفون کرنے کی درخواست کی تھی۔

''کہاں کرو گے؟ کوئی سفارش۔'' معصوم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ماموں جان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘

’’ماموں جان کی تم فکر نہ کرو‘ ہم انہیں خود بلوائیں گے اور تمہاری ملاقات بھی کروائیں گے بس تم ذرا صاف بات بتا دو۔‘‘

’’شاہ جی‘ میں نے کچھ نہیں کیا‘ میں بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ معصوم شاہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔’’اقبال پتر‘ اس کی بات سن رہے ہو نا۔ بچھو بننے کی کوشش میں ہے۔ تم ایسا کرو اسے سب سے پہلے زہر کا اندھیرا دکھاؤ۔ شاید اسے اپنا گناہ یاد آ جائے۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘ ابھی دکھاتا ہوں شاہ جی۔‘‘ اقبال پتر نے طارق کو گردن سے پکڑا اور کمرے سے دھکیلتا ہوا لے گیا۔

معلوم نہیں‘ وہ اسے کہاں لے گیا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور بالکل بے دم ہو رہا تھا۔

''چل شروع ہو جا۔''معصوم شاہ نے اس کے بالوں کو ایک زور دار جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔وہ فرش پر اوندھے منہ جا گرا اور بری طرح ہانپنے لگا۔

''اقبال پتر!''

''جی شاہ جی۔''

''اس کو پانی پلا۔یہ قبر کا اندھیرا دیکھ کر کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہے۔ اس کی قبر میں سانپ وانپ تھے کیا۔''

''جی شاہ جی' کئی سانپ کنڈل مارے بیٹھے تھے۔''

پانی پینے کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔معصوم شاہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے تقریباً لیٹ گیا۔

''اوئے ڈرامااییٹ سکس' سیدھا ہو جا' یہ تھانہ ہے تیرے مامے کا گھر نہیں ہے۔ویسے یار تو اداکار ہوتا تو کتنے غضب کی اداکاری کرتا'

ویسے تیرے سر پر لگی چوٹ نے ہمیں تو دھوکا دے ہی دیا تھا۔'' معصوم شاہ ماچس کی تیلی سے کان کریدتے ہوئے بولا۔ ''کیوں قتل کروایا تو نے اپنی بیوی کو' کیا پیسے کی خاطر؟''

''نہیں شاہ جی۔ یہ سب میں نے پیسے کے لیے نہیں کیا۔ میری بیوی نے میری عزت خاک میں ملا دی تھی۔ اس نے کسی اور سے آشنائی پیدا کر لی تھی۔ میں نے انتقاماً ایسا کیا۔'' یہ کہہ کر طارق نے اپنی زندگی کے تمام واقعات معصوم شاہ کے سامنے بیان کر دیئے۔ باپ اور پھر ماں کا انتقال' ماموں کے گھر پرورش' ممانی اور فائزہ کی بدسلوکی' ماموں جان کی محبت' فائزہ کے بہکے قدم' شادی' شادی کے بعد پھر پرانی روش پر واپسی' قتل کی منصوبہ بندی وغیرہ۔

''میں نے اس آوارہ لڑکی سے محض اپنے ماموں کی آنکھوں میں آنسو پونچھنے کے لیے شادی کی تھی ورنہ اس حالت میں کون مرد شادی

کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس احسان کو وہ زندگی بھر مان کر
میری پوجا کرے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ پھر سے اپنی آوارہ فطرت کی
طرف لوٹ گئی۔ اسے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ میں اس کی بدچلنی سے
واقف ہو گیا۔ میں نے اسے یہ بات قصداً نہیں بتائی تھی۔ ایک سن
میں نے میز پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کا بچا ٹوٹا دیکھا۔ میں نے
اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ گھر میں کوئی آیا تھا، مگر اس نے
اقرار کر کے نہ دیا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ باہر سے کوئی مرد آیا نہیں تو
پھر یہ سگریٹ کا ٹوٹا کہاں سے آیا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے میرے دل
کی حالت خراب کر دی۔ تب میں نے قسم کھائی کہ اس بدفطرت
عورت کو ہر قیمت پر ٹھکانے لگا کر رہوں گا۔ پھر میں اس مرد کی تلاش
میں رہا جو میری غیر موجودگی میں میرے گھر آ کر میرے منہ پر کالک
ملتا تھا۔ اس مرد کا بھی سراغ لگ گیا وہ میرا ہی دوست تھا اور فائزہ اس

سے شادی کی سالگرہ والے دن بھی ملی تھی، کیونکہ اس دن میں نے
اپنے باتھ روم میں بھی سگریٹ کا ٹوٹا پایا تھا۔ اب آپ ہی بتایئے شاہ
جی، ایسی عورت کو میں قتل نہ کراتا تو اور کیا کرتا۔"

طارق کی نشاندہی پر ٹیکسی ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھیوں کو
بھی گرفتار کرلیا گیا۔

جس طرح فائزہ کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ طارق اس کی بدکرداری
سے واقف ہے اور اندر ہی اندر آگ میں سلگ رہا ہے، اسی طرح
طارق یہ کبھی نہیں جان سکے گا کہ اس کی بیوی اس دن سیدھی راہ پر آگئی
تھی۔ اس نے عہد کرلیا تھا کہ وہ آئندہ اس کی ہوکر رہے گی۔ نیکی اور
بدی کے درمیان محض ایک لمحے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ برا نیک بن جاتا
ہے اور نیک برا۔